Urdu Studies
An international, peer-reviewed, bilingual research journal
ISSN: 2583-8784 (Online)
Vol. 4 | Issue 1 | Year 2024
Pages: 58-109

Safarnāma-e Shīrāz

Syed Jalaluddin Haider

سفر نامۂ شیراز[1]

سید جلال الدین حیدر

Abstract. A delegation was sent by the Madarsatul Uloom, Aligarh (now Aligarh Muslim University) to Shiraz, Iran in 1903 for inviting boarders to the college for admission. It was headed by Meer Wilayat Hussain. There are two published travelogues of this delegation; written by Meer Wilayat Hussain and Syed Jalaluddin Haider. Widely known Haider's travelogue is available in his book *Khudnavisht Sawāneḥ'umrī wa Safarnāma* published in 1946. This is a hitherto unknown

[1] ۔ مرتب: ارشد مسعود ہاشمی۔ حواشی: لیلا عبدی خجستہ (تہران)۔ اس سفر نامے کی مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیں: "مدرسۃ العلوم کا شیراز وفد: تین سفر نامے"۔ فکر و نظر، مارچ ۲۰۲۴۔ ص ۸۰-۶۵
https://papers.ssrn.com/sol3/papers.cfm?abstract_id=4825783

ISSN: 2583-8784 (Online)
Included in UGC-CARE List since October 2021
Published on August 11, 2024
http://www.urdustudies.in
https://creativecommons.org/licenses/by-nc-nd/4.0/?ref=chooser-v1

travelogue written by Haider which was published as a series in a magazine in 1912-1914, years before the publication of his book.

Keywords. Safarnama, Urdu travelogues, Shiraz Wafd, Sir Syed Ahmad Khan, Syed Jalaluddin Haider, Meer Wilayat Hussain, Aligarh Muslim University, Madarsatul Uloom

اوائل جون ۱۹۰۳ء میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے طلبا میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ اس سال کی چھٹیوں میں کالج کی طرف سے ایک وفد (ڈیپوٹیشن) شیراز بھیجا جائے گا۔ ان دنوں انجمن "الفرض" کا کاملک میں زور تھا۔ سال بسال اس انجمن کی طرف سے طلبا کا ڈیپوٹیشن ہندوستان کے مختلف صوبوں میں دورہ کرتا۔ کالج کے مقاصد کو لوگوں پر واضح کرتا، بدگمانیوں کو دور کرتا اور کالج کے لیے خاص مالی امداد بہم پہنچاتا۔ شیراز ڈیپوٹیشن کی خبر سن کر اکثروں نے یونہی سمجھا کہ یہ "الفرض" کے اسسٹنٹ کیپر صاحب کے پرجوش دماغ کا نتیجہ ہے۔ ہندوستان میں لڑکوں کی کامیابی دیکھ کر حضرت کو اب تسخیر ایران کا شوق پیدا ہوا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی بعض لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ ماریسن صاحب ایسی بے عقلی کی حرکت کرنے سے اسسٹنٹ کیپر صاحب کو روک دیں گے لیکن جو لوگ جانتے تھے وہ کہتے تھے کہ کہاں اسسٹنٹ کیپر صاحب کی ہمت اور کہاں شیراز کی تسخیر! چنانچہ جون کے آخر آخر یہ بات معلوم ہوگئی کہ خود ماریسن صاحب اس تجویز کے محرک ہیں۔ بلکہ ماریسن صاحب سے کوئی اور بڑی طاقت ہے جو ان سے یہ کام لے رہی ہے۔

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستم گاری میں کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

ٹرسٹیز اختلاف کرتے ہی رہے لیکن پرنسپل صاحب نے کسی نہ کسی طرح اپنے موافق معاملہ کو طے کرلیا۔

میر ولایت حسین صاحب بی اے سکنڈ ماسٹر اس وفد کے افسر مقرر کیے گئے۔ میں ان کا مددگار تجویز ہوا۔ اور طالب علموں میں سے سید ابو محمد صاحب اور جمیل الزماں صاحب معاون قرار پائے۔ ۹/ اگست ۱۹۰۳ء کو اس وفد کی روانگی علی گڑھ سے طے ہو گئی۔

سفر کا اہتمام

خاک پاک ہندوستان کی شاید آب و ہوا کا یہ اثر ہے کہ یہاں کے رہنے والوں میں سفر کا مذاق نہیں۔ ہندوستان سے باہر قدم رکھنا گویا بلا کا سامنا کرنا ہے۔ اگرچہ بحمد للہ رفتہ رفتہ یہ کفر ٹوٹتا جاتا ہے۔ پھر بھی صدیوں کے موروثی اثر جاتے جاتے بھی صدیاں ہی درکار ہوں گی۔ ممبران ڈیپوٹیشن میں سے میرے لیے یہ سفر کوئی نیا نہ تھا۔ مجھے پہلے بھی ایران، عربستان، و عراق عجم ' میں سفر کرنے کا اتفاق پیش آچکا تھا۔ لیکن سفر کی تصمیم ہوتے ہی پہلا خیال یہ ہوا کہ معلوم نہیں کیا اتفاق ہو، اپنے کل اعزا سے مل آنا ضروری ہے۔ چنانچہ کالج سے رخصت لے کر الٰہ آباد، بنارس، اعظم گڑھ، جونپور، گورکھپور اور میرٹھ کی بادیہ پیمائی کرتا پھرا۔ چونکہ میری والدہ عرصہ سے کربلائے معلیٰ میں مقیم تھیں اس وجہ سے میرا موروثی مکان جو اعظم [گڑھ] کے ایک موضع میں ہے، ان دنوں خالی پڑا تھا، لیکن وطن کی محبت مجھے وہاں بھی کھینچ لے گئی۔ سنسان مکان اور خاموش در و دیوار کو دیکھ کر جی بھر آیا اور آنسوؤں کے چند موتی وہاں نثار کر کے چل کھڑا ہوا۔

بنارس سے روانگی کے وقت ایک عجیب سانحہ پیش آیا۔ کاشی کے اسٹیشن سے مجھ کو سوار ہونا تھا۔ میری ایک بہن میرے ساتھ تھی جس کو میں جونپور پہنچانا چاہتا تھا۔ کاشی کے اسٹیشن پر ہمیشہ مسافروں کی کثرت ہوتی ہے۔ ڈاک گاڑی کا وہاں بہ مشکل تین منٹ کے لیے دم لینا، اس روز پانی کا موسلا دھار

برسنا، اترنے چڑھنے والے جاتریوں کا ایک دوسرے پر گرنا، کسی کا رونا، کسی کا چلانا۔ غرض کہ ایک عجیب حشر و نشر کا عالم بپا تھا۔ میں ناکردہ گناہ ان لوگوں کے غول میں، جنھوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر ایک بڑی قطار بنالی تھی، پھنس گیا اور بدقت تمام گاڑی تک پہنچا۔ بہن اور خادمہ کو سوار کرا چکا تھا۔ خود سوار ہونے ہی کو تھا کہ میرا بایاں ہاتھ، جس میں کھلی ہوئی چھتری تھی، ہجوم کے باعث سر سے زیادہ بلند ہو گئی۔ ادھر گاڑی نے سیٹی دی اور بھک بھک کرتی چلی بنتی۔ ہاتھ کے اکھڑنے کا عارضہ مجھ کو پہلے سے تھا لیکن وہ ہمیشہ میری اپنی ہی کوشش سے ایک آدھ منٹ میں بیٹھ جاتا۔ اس دفعہ کچھ ایسی بری طرح اکھڑا تھا کہ بلا ڈاکٹری مدد کے اپنی جگہ پر نہ آیا اور مجھ کو کامل تین گھنٹہ تک کرب میں مبتلا رکھا اور پسینہ سے نہلاتا رہا۔ اس مرتبہ کے بعد بھی دو تین مرتبہ مجھ کو یہ عارضہ لاحق ہو چکا ہے اور اب مجھ کو اچھی طرح سے کان ہو گئے ہیں کہ میرے لیے ضرورت سے زیادہ ہاتھ پھیلانا منع ہے۔ کسی کے سامنے انگڑائی لینا بد تہذیبی میں تو داخل تھا ہی میرے لیے تنہائی میں بھی یہ ایسا جرم ہے کہ اس کی سزا فوراً ملتی ہے۔ حضرت نظام سے منسوب ایک شعر ان کے کسی محبوب کی خاص حالت کا فوٹو عجب پر لطف پیرایہ میں کھینچتا ہے۔ اس موقع پر تو وہ پھبتی سے کم نہیں۔ لیکن شعر خوب قابلِ داد ہے:

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ

دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیے مسکرا کے ہاتھ

روانگی

حسبِ قرار داد سابق یہ وفد ۸ / اگست ۱۹۰۳ء کو علی گڑھ سے روانہ ہوا۔ اسی روز میں بھی میرٹھ سے چل کر دہلی میں اپنے ساتھیوں سے آملا۔ اور شام کے قریب ہم سب ڈاک گاڑی میں براہ بھٹنڈا و سمرسٹہ کراچی کو روانہ ہوئے۔ میر ولایت حسین صاحب چوں کہ ہم سب سے عمر میں زیادہ تھے اور ان

کے عہدۂ پر اکٹری کے باعث سے ہمارے ہم سفر طالب علم ان کی خدمت میں گستاخ بھی نہ تھے۔ اس لیے سفر کے ابتدائی حصے میں سب گم سم بیٹھے رہے۔ میں نے یہ خیال کر کے کہ ابھی مسلسل ڈھائی تین مہینے تک ہم سب کو یک جا رہنا ہے اگر ہم سب ایک دوسرے کے ساتھ بے تکلف نہ ہوئے تو بڑی تکلیف کا سامنا ہو گا۔ اور چوں کہ میر صاحب اور طالب علموں کے درمیان حد مشترک میں ہی تھا۔ اس لیے میں نے میر صاحب سے درخواست کی کہ ہم سب کو اس حد تک بے تکلف ہونے کی اجازت دیجیے جو خلافِ تہذیب نہ ہو۔ اس کو میر صاحب نے بخوشی و خندہ پیشانی منظور ہی نہیں کیا بلکہ خود لڑکوں سے بے تکلف ہونے کی درخواست کی۔ میر صاحب کے جرات دلانے سے ہم سب رفتہ رفتہ مخلی بالطبع ہوئے۔ ہمارے سکنڈ کلاس کی گاڑی میں ہم چاروں کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ پہلے میں نے حافظ کی روح کو شاد کرنا شروع کیا۔ پھر سید ابو محمد صاحب میرے شریک ہوئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ میر صاحب نے فرمائشات شروع کر دیں۔ اس طرح رات کا ایک معتدبہ حصہ گزر گیا۔ نصف شب کے بعد ہم نے بھٹنڈے میں گاڑی بدلی۔ اور صبح کو سمرسٹہ پہنچے۔ اتنی راہ کے متعلق اس قدر اور بیان کرنا ہے کہ شب کو جب ہم سوئے تھے تو خاصے بھلے چنگے تھے۔ صبح کو جو اٹھے تو ہیئت ایسی بدل ہو گئی تھی کہ پہچانے نہ جاتے تھے۔ اگر مبالغہ سمجھ جائے تو ایسے تو ضرور ہو گئے تھے کہ کسی کو منہ دکھانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ داڑھی مونچھ اور بھوؤں تک کے بال رات ہی بھر میں سفید ہو گئے تھے۔ کپڑے کا رنگ خواہ کچھ ہی رہا ہو، اس وقت سب مل گجے تھے۔ کپڑے تو ایک طرف خود انسانوں میں وہ یک رنگی سمائی تھی کہ کالے گورے کا ذرا فرق باقی نہ تھا۔ میدان کی ہوا اور بیابان کی ریگ نے شاید ہمیں بے والی وارث شہیدان راہ خدا سمجھ کر دفن کرنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن ہم نے جلد کروٹ لی اور بچ نکلے۔

سمرسٹہ سے روانہ ہونے کے وقت ہمارا ایک بورا جس میں برتن اور کھانے کی چیزیں تھیں اور جو اب تک ہمارے ساتھ گاڑی میں آیا تھا اسٹیشن ماسٹر کی زبردستی سے بریک میں رکھے جانے کے لیے

اتار لیا گیا اور جلدی کے سبب سے بریک میں بھی نہ رکھا جا سکا۔ یہ تو ہمیں امید تھی کہ کراچی میں پہنچ کر کسی نہ کسی وقت ہم کو بورا مل جائے گا۔ اور اس کے اندر اسباب کی بھی، سب کی نہیں تو تھوڑے بہت کم مل جانے سے ناامیدی نہیں تھی۔ لیکن اس وقت مشکل یہ تھی کہ کھانے پینے کی سب چیزیں اسی میں رہ گئیں تھیں۔ اور اس طرف کے اسٹیشنوں کا بھی حال معلوم تھا کہ بھوکے بھلے مانسوں کو زیادہ تر بجائے کھانے کے غم ہی کھانا پڑتا ہے۔ بہر حال تن بہ تقدیر سوار ہوئے۔ ہم لوگ جس گاڑی میں سوار ہوئے اس میں پہلے سے دو مُشّیّن مسلمان بیٹھے ہوئے تھے، اور جیسا کہ دستور ہے، نئے آنے والوں سے کچھ خوش نہیں ہوئے۔ انگریزی تہذیب تو شاید اس کی مقتضی تھی کہ ہم لوگ اجنبیوں سے ہم کلام نہ ہوتے اور ابتداءً ہم نے بھی سوا اسلام علیکم کا تحفہ پیش کر دینے کے اور زیادہ جرات نہیں کی۔ لیکن جب ہم نے تھوڑی دیر کے بعد ان کو اپنی طرف مخاطب پایا تو پھر بات چیت شروع کر دی۔ اور ہم کو بھی معلوم ہو گیا کہ ان میں ایک بزرگ ریاست بہاولپور کے فارن منسٹر اور دوسرے اسسٹنٹ ڈائرکٹر ہیں۔ اب اجنبیت جاتی رہی اور آپس میں سلسلۂ کلام برابر جاری رہا۔ علی گڑھ کے متعلق ان کی واقفیت اور بہاولپور کے متعلق ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد ان حضرات نے اپنا دستر خوان کھولا اور ہم لوگوں سے بھی شرکت کی درخواست کی۔ حقیقت یہ ہے کہ سخت بھوک لگی ہوئی تھی، لذیذ کھانوں کی خوشبو ناک میں تیزی کے ساتھ گھس رہی تھی اور بے چین کیے دیتی تھی۔ منہ میں پانی بھر آتا تھا۔ اور عجب نہیں کہ آنکھ بھی دل کا آئینہ بن رہی ہو۔ لیکن تہذیب اور حمیت اس طرح سے کھانے پر گرنے سے باز رکھ رہی تھی۔ ہم نے انکار کیا اور بہت انکار کیا۔ لیکن انھوں نے بھی اصرار کا کوئی دقیقہ نہ چھوڑا۔ آخر ش ہم ان کے شریک ہوئے اور منعم مجازی اور حقیقی دونوں کا شکریہ بجالائے۔

کارساز ما بہ فکر کار ما فکر ما در کار ما آزار ما [۲]

کراچی

۱۰/ اگست کی صبح کو ہم کراچی پہنچے۔ اور سیدھے اسلامیہ مدرسہ میں جا داخل ہوئے۔ اسلامیہ مدرسہ کے اسٹاف میں مولوی حمید الدین صاحب بی اے، مسٹر سعادت علی خاں صاحب اور مسٹر سید عبد اللہ صاحب جعفری ہمارے کالج کے پرانے طلبا موجود تھے۔ ان حضرات نے ہماری خاطر داری اور آرام دہی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ علی الخصوص سعادت علی خاں صاحب نے ہمارے کل امور کا انصرام جو کراچی سے متعلق تھے اپنے ذمہ لیا اور ان کی انجام دہی میں ہمہ تن مصروف رہے۔

ہمارے زمانہ قیام کراچی میں یہ تجویز ہوئی کہ ایک عام جلسہ اسلامیہ مدرسہ میں کرنا چاہیے، جس میں تعلیم کی ضرورت پر لکچر دیا جائے اور مسلمانانِ کراچی کو اسلامیہ مدرسہ کراچی میں زیادہ دلچسپی لینے کی ترغیب دی جائے۔ چنانچہ نہایت تعجیل کے ساتھ اس کا انتظام کیا گیا۔ مسٹر کمنگ صاحب کمشنر سندھ نے صدر جلسہ ہونا قبول فرمایا اور ایک روز قبل تمام شہر میں چھپے ہوئے نوٹس تقسیم کر دیے گئے۔ جلسہ اچھا ہوا۔ اسلامیہ مدرسہ کا بڑا ہال عمائد شہر اور طلبا سے پُر تھا۔ صدر جلسہ نے اولاً جلسہ کی غرض بیان کی اور پھر ہمارا تعارف شرکائے جلسہ سے کرا کر تقریر کرنے کی اجازت دی۔ چنانچہ سید ابو محمد صاحب نے ایک پُرجوش تقریر انگریزی میں کی۔ سید صاحب کو تقریر کرنے کی خاص مہارت تھی چنانچہ وہ تادیر مسلمانانِ کراچی کو تعلیمی امور اور خاص کر اسلامیہ مدرسہ کی طرف زیادہ متوجہ ہونے کی ترغیب دیتے رہے۔ سید صاحب کے بعد میری باری آئی۔ میری تقریر اردو میں تھی اور مجھ سے بھی جہاں تک ہو سکا قرآن و حدیث کی مدد سے اور آل و اصحاب کی نظیر سے درس و تدریس کی جانب تحریص کرتا رہا۔ جلسہ کامیابی کے ساتھ ختم ہوا۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ کم سے کم اس وقت تو سامعین کے قلوب امور خیر کی طرف مائل ہو گئے ہیں۔

کراچی میں اب سے نو سال قبل بھی مجھے آنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اگرچہ اس وقت بالکل ہی سرسری نظر سے شہر کو دیکھ سکا تھا۔ لیکن پھر بھی اس قدر سمجھ میں آتا تھا کہ اتنے عرصہ میں اس شہر نے نمایاں ترقی کرلی ہے۔ بکثرت عمارات عالیشان بن گئی ہیں اور بنتی جاتی ہیں۔ اسلامیہ مدرسہ خود شاندار دو منزلہ عمارت ہے۔ اوپر نیچے دونوں جگہ بڑے ہال ہیں۔ اور کلاسوں کے کمرے بھی اچھے خاصے ہیں۔ مدرسہ کی عمارت کی دونوں جانب دو مسجدیں ہیں۔ جن میں سے ایک طلبائے اہل سنت کے لیے اور دوسری حضرات شیعہ کے واسطے ہے۔ بورڈنگ خوب بڑا ہے لیکن اس کے کمرے شاندار نہیں ہیں۔ البتہ بورڈنگ کا ایک حصہ جو میران سندھ کے خاندان کے لیے خصوص ہے وہ اچھا ہے۔ اسلامیہ مدرسہ میں پہلے پہل میں نے مسلمانوں کو سر پر پورے بال، مثل عورتوں کے، رکھے ہوئے دیکھا۔ معلوم ہوا کہ میران سندھ کے خاندان اور ان کے متوسلوں میں اسی کا رواج ہے۔

بمبئی اور کلکتہ کے بعد غالباً کراچی ہی کو یہ شرف حاصل ہوا کہ وہاں کی سڑکوں پر ٹریم چلتی ہے۔ ان کا باقاعدہ آنا جانا اور صرف دو گھوڑوں کا دو درجہ کی بھری ہوئی گاڑیوں کو آہنی سڑکوں پر آسانی سے کھینچے لیے جانا قابلِ دید نظارہ ہوتا ہے۔ کراچی کا چڑیا خانہ بھی بڑا اور اچھا ہے۔ کراچی کی حفاظت کے لیے انگریزوں نے بندرگاہ سے متصل ایک جزیرہ میں مضبوط قلعہ بنالیا ہے۔ اور اس کو خوب سامان حرب سے مصلح کر رکھا ہے۔ اس جزیرہ کی سیر بھی خالی از لطف نہیں۔ منور اڈفنسز [منوڑہ چھاؤنی] کے نام سے یہ جگہ مشہور ہے۔ اس جزیرہ میں جہازوں کی ہدایت کے لیے ایک اونچا منارہ بنا ہوا ہے جو لائٹ ہاؤس کہلاتا ہے۔ یہاں پر یکرس بھی قابل دید ہیں۔ یہ ایک مختصر سی دیوار ہی جو سمندر میں بنائی گئی ہے اور سطح سمندر سے زیادہ بلند نہیں ہے۔ اس پر جب لہریں آکر ٹکراتی اور پار ہوتی ہیں تو جھاگ کی بہت بڑی سفید چادر بن جاتی ہے اور نہایت بھلی معلوم ہوتی ہے۔

کراچی سے روانگی

ابتدا ہی میں جب سے کہ ہم لوگوں کا شیراز جانا طے پا گیا تھا میر ولایت حسین صاحب نے پاسپورٹ حاصل کرنے کے لیے درخواست دے دی تھی۔ لیکن چونکہ ہماری روانگی تک پاس پورٹ وصول نہیں ہوا تھا اس لیے کراچی میں حاصل کیا گیا۔ ملک غیر میں جانے کے لیے یہ پاسپورٹ جو تذکرہ بھی کہلاتا ہے، نہایت ضروری ہے۔ اس میں صاحبِ تذکرہ کا نام، ولدیت اور سکونت وغیرہ درج ہوتی ہے۔ یہ اس بات کی سند ہے کہ صاحبِ تذکرہ رعایاے برٹش گورنمنٹ سے ہے اور ضرورت کے وقت اس کو برٹش قنصل سے مدد مل سکتی ہے۔

۱۰/ اگست کو ہمارا جہاز کراچی سے روانہ ہونے والا تھا۔ چنانچہ اس روز صبح سے ہم لوگوں کو مع اپنے اسباب کے قرنطینہ کے دفتر میں حاضر ہونا پڑا۔ کامل تین گھنٹہ تک صحن میں انتظار کرنے کے بعد جہاں پر بیٹھنے کے لیے کوئی چیز بھی نہ تھی، ایک سیاہ فام عیسائی ڈاکٹر برآمد ہوا۔ تمام مسافر ایک قطار میں کھڑے کر دیے گئے اور ان بزرگ نے دو منٹ میں سب کی نبض دیکھ لی۔ ہاتھوں پر معائنہ کا نشان بنایا گیا اور جہاز پر جانے کی اجازت مل گئی۔ اسی اثنا میں ہمارے بستر اور بعض اور چیزوں کو دھونی دی گئی۔ ہم مع اسباب قرنطینہ کی کشتیوں کے ذریعے سے جہاز پر پہنچے۔ ہم کو رخصت کرنے کے لیے ہمارے دوست دوسری کشتی پر جہاز تک آئے۔ لیکن ان کو ہمارے پاس آنے کی یا ہم کو ان کے پاس جانے کی اجازت نہ تھی۔ وہ لوگ ہم کو دور ہی سے خدا حافظ کہہ کر رخصت ہوئے۔ شام کے پانچ بجے جہاز نے آخری بگل دیا اور آہستہ آہستہ بندر گاہ سے باہر نکلا۔ جہاز جیوں جیوں بندر گاہ سے نکلتا جاتا تھا۔ ہماری پُر حسرت نظر کنارے اور سواد شہر پر اور بے چینی سے پڑتی تھی۔ دریا کے سفر کی عادت نہ ہونے سے

معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ہم اپنے پیروں سے موت کے منہ میں چلے جارہے تھے۔ اور خشکی پر حسرت بھری نگاہیں اس طرح ڈال رہے تھے جیسے اب پھر اس کے دیکھنے کی امید نہ ہو۔

دم رفتن است عرفی بہ رخش نظارہ کن [۳]
کہ امید بازگشتن کس از ایں سفر ندارد

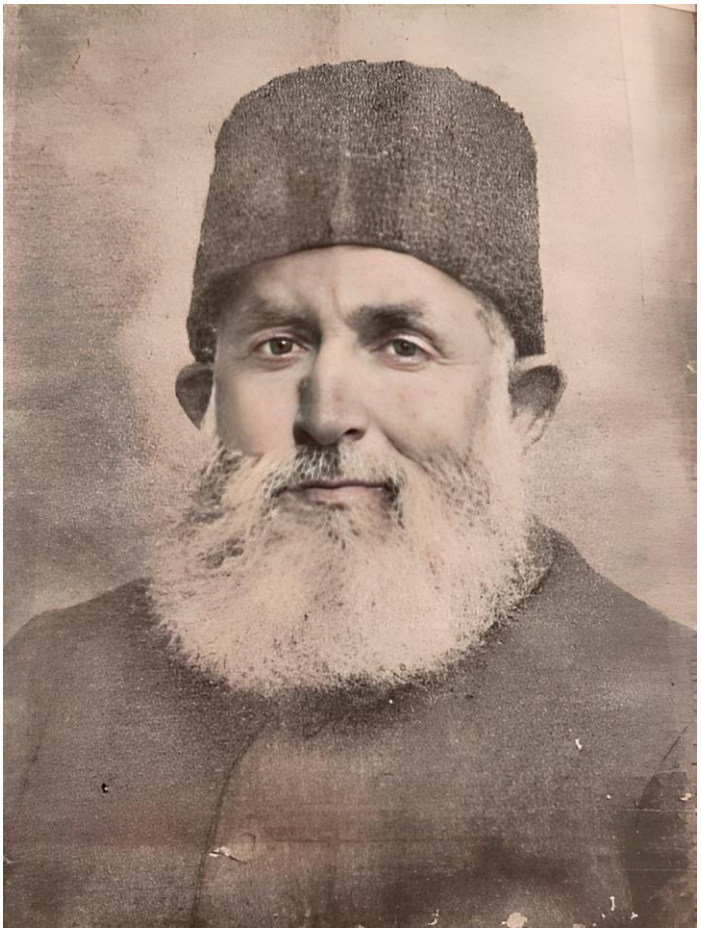

سید جلال الدین حیدر (۲/ فروری ۱۸۷۲ء تا ۱۴/ اکتوبر ۱۹۴۸ء)

جہاز ہزارہ

انسان کی مصنوعات میں سے جہاز بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں۔ جن لوگوں کو جہازوں کے دیکھنے کا برابر اتفاق ہوتا رہتا ہے ان کی حیرت تو جاتی رہتی ہے لیکن نئے آدمی کے لیے اس کا دیکھنا اور سمجھنا مصیبتوں کا سامنا ہے۔ جہاز کو ایک متوسط درجہ کا چہار یا پانچ منزلہ مکان سمجھنا چاہیے۔ حصہ زیریں میں جو تقریباً نصف حجم کے برابر ہوتا ہے مال کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ اس سے اوپر کا حصہ جو تتق کہلاتا ہے، کبھی مال رکھنے کے لیے اور کبھی عام مسافروں کے رہنے کے لیے کام میں آتا ہے۔ انجن وغیرہ بھی یہیں ہوتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جہاز رانی کی ساری کلیں تو حصہ زیریں سے لے کر آخر عرشہ تک برابر ہی چلی جاتی ہیں۔ اس سے اوپر کا حصہ، جو ڈک یا سطحہ کہلاتا ہے، عام مسافروں یا گھوڑوں اور دوسرے جانوروں کے لانے اور لے جانے کے کام آتا ہے۔ اس حصہ اور اس سے نیچے کے حصے میں اول اور دوم درجہ کے مسافروں کی کوٹھریاں افسروں کی کیبنیں (کوٹھریاں) وغیرہ ہوتی ہیں۔ ان کوٹھریوں کی چھت، جو اب چوتھا درجہ ہوا، اول درجہ کے مسافروں کے بیٹھنے اٹھنے اور تفریح کے کام آتا ہے۔ سب سے اوپر ایک مختصر سی چھت بطور پل کے ہوتی ہے جہاں افسر متعینہ برابر ٹہلتا رہتا ہے اور اسی کے حکم سے جہاز کا رخ بدلتا اور رفتار گھٹتی بڑھتی ہے۔ سمندر کے سکون کی حالت میں جہاز کے چلنے میں ذرا بھی حرکت محسوس نہیں ہوتی اور ہوا و طوفان کی حالت میں الامان! ادھر کی چیزیں ادھر اور اُدھر کی اِدھر۔ یہ تو معمولی بات ہے انسان کو اپنی جگہ پڑا رہنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ رفتار معمولاً دس بارہ میل فی گھنٹہ ہوتی ہے۔ ہم جس جہاز پر سوار ہوئے تھے یہ اصل میں مال کا جہاز تھا جو تمام درمیانی بندروں سے مال لیتا دیتا بوشہر کو جا رہا تھا۔ اس کا نام ہزارہ تھا۔ اس کے افسر کچھ زیادہ خلیق نہ تھے۔

مسافروں کی تعداد بھی زیادہ نہ تھی۔ جہاز پر ایک خاص قسم کی بو بسی ہوتی ہے کہ ہر مسافر کو عموماً اور نئے آدمیوں کو خصوصاً نہایت تکلیف دہ معلوم ہوتی ہے۔ سفر کے ابتدائی دو تین دن نہایت بے لطف گزرتے ہیں۔ متلی ہوا کرتی ہے اور استفراغ ہوتا رہتا ہے۔ لیکن اس سے ڈرنا بالکل نہیں چاہیے۔ کھانا کھاتے رہنا چاہیے۔ دو تین روز میں طبیعت عادی ہو جاتی ہے اور آدمی اچھا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس مرتبہ بھی سب لوگ بیمار پڑے۔ میرے اور ساتھی تو جلد اچھے ہو گئے لیکن مجھ کو اچھے ہونے میں تین دن لگ گئے۔ ہم لوگوں نے ٹکٹ دوسرے درجے کا لیا تھا اس لیے ہم کو ایک کوٹھری جس میں ریل کی طرح اوپر نیچے کر کے چار بستر تھے ملی تھی۔ لیکن وہ اس قدر تنگ اور کم ہوادار تھی کہ سوا پہلے دن کے ہم نے باقی دنوں میں اس کے اندر رہنا بالکل پسند نہ کیا۔ تیسرے درجہ کے مسافروں کے ساتھ کھلی ہوئی جگہ میں پڑے رہا کرتے تھے۔

ہمارے ساتھ جہاز میں کراچی کے دو تاجر، سیٹھ فقیر محمد صاحب اور حاجی عبد اللہ بھی تھے۔ یہ دونوں صاحب اپنی تجارتی ضرورتوں سے بندر عباس جا رہے تھے ان حضرات سے شروع ہی میں ملاقات ہو گئی اور پھر کئی روز تک ساتھ رہنے سے آپس میں ایک قسم کا اتحاد سا ہو گیا۔ یہ لوگ پڑھے لکھے بہت کم تھے۔ لیکن بڑے جہاں دیدہ و تجربہ کار، پختہ مغز اور ہوشیار تھے۔ دریا کا سفر بارہا کر چکے تھے۔ ان کی باعث سے ہم لوگوں کو بہت آرام ملا اور ایران اور ایرانیوں کے متعلق بہت کچھ حالات معلوم ہوئے۔

راہ کے بندرگاہ

کراچی سے روانہ ہو کر پہلا بندرگاہ گوادور نامی ملا۔ یہاں سے روانہ ہو کر مسقط پہنچے۔ یہاں پہنچنے پر جہاز نے سلطان مسقط کی سلامی کی توپ چھوڑی۔ یہاں کا حلوا بہت مشہور ہے اور تحفہ کے طور سے

ہندوستان لایا جاتا ہے۔ لیکن مجھ کو بالکل پسند نہیں۔ بندر گاہ تین طرف اونچے پہاڑوں سے محصور ہے۔ گرمی نہایت شدید ہے۔ معلوم ہوا کہ یہاں خوارج بہت کثرت سے آباد ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو حضرت علی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو قابلِ نفریں جانتے ہیں۔ مسقط سے روانہ ہو کر بندر عباس کے قریب ہمارا جہاز ایک بڑی چٹان پر چڑھ گیا۔ وہاں چھ گھنٹے معطل رہنا پڑا، دوسرے دن جب سمندر میں پھر مدّ آیا تو جہاز نے اپنی قید سے رہائی پائی۔ افسروں سے معلوم ہوا کہ جہاز ٹکرا کر ٹوٹ جانے سے بال بال بچ گیا۔ بندر عباس پر سیٹھ فقیر محمد اور ان کے ساتھی اتر گئے۔ اتنا سفر ان کی بدولت نہایت آرام و لطف سے کٹا۔ بندر عباس کے بعد لنگاہ ملا۔ سمندر کے کنارے شہر کے مکانات دور سے اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ دوسرے دن بحرین پہنچے۔ یہاں مارواڑی تاجر جو موتیوں کی تجارت کرتے ہیں اترے۔ اس جزیرہ کے قریب سمندر میں سے اچھے قیمتی موتی نکلتے ہیں۔ خلیج فارس کے بندر گاہوں سے کچھ ایرانی بھی بوشہر جانے کے لیے جہاز پر سوار ہو گئے ہیں۔ ان کی آپس میں وہ تو تو میں میں رہتی ہے کہ خدا کی پناہ لیکن ہم لوگوں کے ساتھ انسانیت سے پیش آتے ہیں۔ ان میں سے ایک صاحب نے جو ہمارے ساتھ زیادہ تپاک سے ملتے ہیں اپنے تئیں سالار معظم گورنر بوشہر کا مصاحب بتایا ہے اور ہم کو بوشہر میں ہر طرح کی مدد دینے کے بہت سے وعدے کیے۔ ایک روز میں نے ایک دوسرے ایرانی ہم سفر کو کھانا کھاتے دیکھا۔ علاوہ اور کھانوں کے وہ تھیلے میں سے ایک چیز نکال کر کھا رہے تھے جس کا رنگ زعفرانی تھا اور شکل ایک بڑی انگوٹھی سے ملتی جلتی تھی۔ میں نے یہ چیز پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس وجہ سے اس کو تعجب کے ساتھ دیکھ رہا تھا اور سمجھتا تھا کہ یہ کوئی مٹھائی کی قسم ہو گی۔ میرے تعجب سے دیکھنے پر ان میں سے چند چھلے مجھے بھی دیے اور بتایا کہ یہ مچھلی ہے۔ جب میں نے ہاتھ میں لے کر غور سے دیکھا تو

واقعاً یہ جھینگا مچھلی ہے۔ لیکن اس قدو قامت سے کہیں زیادہ ہے جس کے دیکھنے کا میں اپنے وطن میں عادی تھا۔ اس کو سکھا کر اور ابال کر رکھ لیا تھا۔ ہمارے ہم سفر نے اس مچھلی کے مفید ہونے کے اس قدر پل باندھنے شروع کیے کہ ان کے اتباع میں میں نے بھی ایک مچھلی منہ میں رکھ لی۔ منہ میں رکھنا تھا کہ میری جان پر بن گئی۔ ایسی بدذائقہ بدرایحہ بدطعم چیز میں نے کبھی پہلے منہ میں نہیں رکھی تھی۔ نگلنے سے طبیعت کو استکراہ، اگلنے سے تہذیب مانع۔ عجب مشکل میں پھنسا تھا۔ کسی نہ کسی طرح نگل گیا اور وہاں سے جلدی کسی حیلہ سے ہٹ آیا۔

ایک اور واقعہ

بعینہٖ ایسا ہی واقعہ مجھ کو مدینہ منورہ میں پیش آیا تھا۔ یوم عاشورہ کو میں وہاں عربوں کی مجلس میں شریک ہوا۔ عرب یا عجم کے شیعوں میں دہم محرم کو فاقہ کرنے کا رواج، جیسا کہ ہندوستان میں ہے، نہیں ہے۔ چنانچہ لوگ گریہ وبکا میں بھی مصروف تھے اور چاے، قہوہ اور حقہ کا دور بھی مسلسل چل رہا تھا۔ قہوہ کے دور میں میرے سامنے بھی ایک نہایت چھوٹی پیالی میں اس قدر مختصر سا قہوہ کہ جس کو اشک بلبل کہنا تھوڑا ہی سا مبالغہ ہو گا، پیش کیا گیا۔ مجلس کے سب لوگ پیتے چلے آتے تھے۔ میں کیا جانتا تھا کہ میرے منہ میں ایسا سم قاتل ہو گا۔ زبان پر آنا تھا کہ میری طبیعت بے کیف ہونی شروع ہوئی۔ لوگ اپنے رونے پیٹنے میں مصروف تھے۔ کسی نے میری طرف خیال نہیں کیا میں نے جلدی سے رومال میں لے لیا اور جان بچائی۔

بوشہر پہنچنا

بحرین سے روانہ ہو کر دوسرے دن ۲۴ / اگست کو ہمارا جہاز بوشہر پہنچا۔ ڈاکٹر اور مردمان قرنطینہ نشان شیر و شمشیر ٹوپیوں پر لگائے آ پہنچے اور سب مسافروں سے چار روپیہ فی کس محصول وصول کر لیا۔ ہم کو کراچی سے روانہ ہوئے آج نو دن ہوئے ہیں، اس لیے بجائے اس جزیرہ میں لے جانے کے جہاں قرنطینہ میں لوگ رہتے ہیں، اس جہاز کے مسافروں کو ایک شب اسی جہاز پر رہ کر دس دن پورے کر لینے کی اجازت مل گئی۔ چنانچہ شب بسر کر لینے کے بعد صبح کو قرنطینہ کے سپاہی آموجود ہوئے اور اپنی کشتیوں پر ہم کو کنارے پر چنگی گھر کے دروازہ پر، جو کمرک کہلاتا ہے، پہنچا دیا۔ یہاں ہمارے اسباب کی دیکھ بھال ہوئی لیکن چونکہ کوئی محصولی چیز برآمد نہیں ہوئی اس لیے یہاں سے بلا ٹکس دیے چھوٹ گئے۔ پاسپورٹ کے سرکاری معائنہ کے وقت ایرانی قنصل کے دستخط نہ نکلے۔ لہٰذا اس کو یہاں درست کرانے کے لیے فی کس چار روپیہ پھر دینے پڑے۔

سرائے

بوشہر میں پہنچنے اور محصولوں کی آفت سے نجات پانے کے بعد قیام گاہ کی فکر ہوئی دریافت سے معلوم ہوا کہ چنگی گھر سے قریب ہی ایک سرائے ہے۔ چنانچہ ہم لوگ وہاں جا اترے۔ ان مراحل کے طے کرنے میں دوپہر کا وقت آ گیا تھا۔ خاصی بھوک لگی ہوئی تھی۔ بطور خود پکوانے کا وقت نہیں رہا تھا اس لیے بازار میں جو کھانا مل سکا، منگا لیا گیا اور دیو اشتہا کی نذر کیا گیا۔ اس سے فارغ ہو کر ذرا آرام لینے کے لیے جو ہم لیٹے تو اپنی مسافرت کا خیال آیا اس وقت سارے شہر میں نہ کوئی ہمارا جاننے والا تھا اور نہ ہم کسی کو جانتے تھے۔

مبارکباد منزل آں تیر مل بے کس و کو را
کہ نہ کس را مبارکباد گوید نے کسے او را [۴]

ایران کی سرائیں علی العموم ہندوستان کی عام سراؤں سے بدرجہا بہتر ہوتی ہیں۔ اکثر دو منزلہ کمرے فراخ اور کشادہ۔ شب میں سونے کے لیے اوپر چھت۔ البتہ صفائی سے کوئی واسطہ نہیں۔ ہر طرح کا میلا جہاں تہاں پڑا ملتا ہے۔ سرائے والا اس خدمت کے لیے بھی فوراً آمادہ ہو جاتا ہے جس میں اس کے اپنے نفع کی بھی کوئی صورت ہو۔

سرا میں کنواں بھی معہ ڈول کے ہوتا ہے لیکن چونکہ اس کا پانی اکثر کھاری ہوتا ہے اس لیے پکانے اور پینے کے لیے پانی بہ قیمت لینا پڑتا ہے۔

سیٹھ ابراہیم اور دوسرے ہندی

سیٹھ فقیر محمد صاحب نے جو بندر عباس تک ہمارے ہم سفر تھے اور جن کا ذکر پہلے آچکا ہے علاوہ اور مہربانیوں کے ایک مہربانی یہ بھی کی تھی کہ ہم کو ایک خط سیٹھ ابراہیم صاحب تاجر بوشہر کے نام تعارف کرانے کی غرض سے دے دیا تھا۔ چنانچہ جب اس خط کے ذریعے سے ہم ان کے پاس گئے تو وہ نہایت گرم جوشی اور تپاک کے ساتھ ہم سے ملے اور فوراً اپنا آدمی بھیج کر ہمارا اسباب سرائے سے منگوالیا۔ ان کے مکان میں آجانے کو تو ہم بہت غنیمت سمجھے لیکن چاہتے یہ تھے کہ کھانا اپنا پکوا کر کھائیں مگر انھوں نے اس کو کسی طرح منظور نہیں کیا اور بہ اصرار تمام ہم کو اپنا مہمان بنائے رکھا۔ ان کے یہاں روزانہ کھانے کی ترکیب یہ تھی کہ ایک بڑی سینی میں چاول پک کر آجاتے تھے کھانے والے اس کے گرد بیٹھ جاتے تھے۔ دو دو آدمیوں کے درمیان ایک ایک بڑا پیالہ سالن کا جس میں کبھی

گوشت ہوتا کبھی مچھلی، رکھ دیا جاتا۔ اور مشترک سینی میں سے ہر شخص اپنی اشتہا کے مطابق کھالیتا۔ ایک روز سیٹھ صاحب نے خاص طور پر ہم لوگوں کی دعوت کی جس میں انھوں نے بوشہر کے کل ہندیوں کو مدعو کیا تھا۔ یہ جلسہ نہایت اچھا تھا، کھانا پر تکلف تھا، اگرچہ کھانے کا طرز روزانہ ہی کا تھا۔ پندرہ سولہ آدمی شریک ہوئے تھے جن میں سے اکثر تو تجارت پیشہ تھے۔ بعض ریزیڈنسی میں ملازم تھے۔ ان حضرات سے مل کر نہایت خوشی ہوئی اور کلفت غربت بالکل جاتی رہی یہ ہندی حضرات ہندوستان کے مختلف حصوں کے رہنے والے ہیں لیکن چونکہ تعداد میں بہت ہی تھوڑے ہیں اس لیے آپس میں خوب ملے جلے ہوئے ہیں۔ شام کو سب ایک جگہ مل بیٹھتے ہیں اور دنیاوی افکار کو تھوڑی دیر کے لیے بالائے طاق رکھ کر خوش وخرم وقت گزار لیتے ہیں۔

ریزیڈنسی اور مسٹر اسکویرا

بوشہر میں پہنچے اور منزل کر لینے کے لیے بعد ہم برٹش قنصل سے ملنے ریزیڈنسی میں گئے وہاں جاکر معلوم ہوا کہ قنصل صاحب شیراز میں ہیں اور ابھی وہیں رہیں گے۔ لیکن مسٹر اسکویرا نائب قنصل اور مسٹر ہنٹ قنصل کے فرسٹ اسسٹنٹ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ یہ حضرات بڑی انسانیت کے ساتھ ملے۔ ہمارے مقاصد کے ساتھ بڑی ہمدردی ظاہر کی اور ہماری روانگیٔ شیراز کے متعلق کل اہتمام کے ذمہ دار ہوئے۔ دوسرے روز شام کو مسٹر اسکویرا نے ہم لوگوں کو اپنے یہاں چاے پر بلایا۔ یہ دو ڈھائی گھنٹے کی صحبت نہایت لطف سے کٹی۔ مسز اور مس اسکویرا بھی تشریف رکھتی تھیں جن سے مختلف مضامین پر باتیں ہوتی رہیں۔ مس صاحبہ نے اپنے والد کے حکم سے مہمانوں کی خاطر پیانو بھی بجایا۔

اس صحبت میں مجھ کو اپنا نہایت بیکسی کی حالت میں اب سے ٹھیک نو برس پہلے اسی مکان میں آنا یاد آیا۔ ۱۸۹۴ء میں حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ سے فارغ ہو کر میں جدہ سے بصرہ جارہا تھا۔

بوشہر میں ہمارا جہاز تین روز کے لیے لنگر انداز ہوا۔ اس زمانہ میں میں ایف اے پاس کر چکا تھا اور انگریزی بول لیتا تھا اس وجہ سے جہاز کے کپتان اور ڈاکٹر صاحبان سے ارتباط پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ جب جہاز بوشہر میں آکر ٹھہرا تو کپتان اور ڈاکٹر خشکی پر آئے۔ مجھ کو بھی اپنے ساتھ لائے۔ کپتان تو اپنے کسی دوست سے ملنے جہاز کے دفتر میں چلا گیا۔ میں ڈاکٹر کے ساتھ شہر میں پھرتا رہا۔ پھرتے پھراتے شام ہو گئی۔ جب سمندر کے کنارے جہاز پر جانے کی غرض سے پہنچے تو ہوا بھی کسی قدر تند ہو رہی تھی۔ ملاحوں نے کشتی کا کرایہ معمول سے دوچند مانگا اور کسی طرح کم پر راضی نہ ہوئے۔ اسی اثنا میں ڈاکٹر صاحب کو آسمان کی سوجھنے لگی شہر میں۔ ایک ارمنی کی دکان پر خوب شراب چڑھائی تھی اور اب اس نے اپنا اثر کرنا شروع کیا تھا۔ میری جان عذاب میں گرفتار تھی۔ میں چاہتا تھا کہ کسی طرح جہاز پر پہنچوں اور اس عذاب سے چھوٹوں۔ ادھر کشتی والے تھے کہ جانے ہی سے انکار کر رہے تھے ادھر صاحب بہادر تھے کے جو کچھ زبان پر آتا تھا بکتے چلے جاتے تھے اور معمولی کرایہ سے ایک حبہ زائد دینا نہیں چاہتے تھے۔ آخر کار جب صاحب کی زبان درازی حد کو پہنچ گئی تو کشتی والوں نے ہاتھ سے جواب دینے کا ارادہ کیا۔ میں نے بہ مشکل تمام صاحب کو وہاں سے علاحدہ کیا۔ اب مشکل یہ تھی کہ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ جائیں تو کہاں جائیں، رہیں تو کہاں رہیں۔ میں تنہا ہوتا تو شاید کسی سرائے میں جا پڑتا۔ لیکن صاحب کو لے کر کہاں جاؤں۔ صاحب سے کچھ پوچھتا ہوں تو سوال از آسمان جواب از ریسماں کا مضمون ہوتا ہے۔ آخر میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ ریزیڈنسی میں چلنا چاہیے۔ وہاں کی مدد سے شاید کوئی کشتی مل جائے اور ہم اپنے جہاز تک پہنچ سکیں۔ چنانچہ اس قصد سے میں ریزیڈنسی کی طرف روانہ ہوا۔ کشتیوں کے گھاٹ سے ریزیڈنسی ایک میل سے زائد ہو گی لیکن صاحب کو میں دو گھنٹہ سے کم میں وہاں تک نہ پہنچا سکا۔ راہ میں چھوٹے چھوٹے ایرانی بچے ہم پر کنکر پھینکتے اور "بکشید ایں قرم ساق را، بکشید ایں کافراں را"[5] کے نعرے بلند کرتے جاتے تھے۔ جب میں ذرا ڈانٹتا تو بھاگ جاتے

اور پھر لوٹ آتے۔ ان کے لیے ہم ایک اچھا تماشہ بنے ہوئے تھے۔ بہ ہزار خرابی جب نائب قنصل کے مکان پر پہنچے کیونکہ قنصل صاحب اس زمانہ میں شیراز ہی میں تھے تو معلوم ہوا کہ وہ باہر گئے ہوئے ہیں اور علی العموم بارہ بارہ بجے رات تک نہیں آتے۔ لیکن ہمارے صاحب بہادر نے اس مکان پر پہنچ کر اس کو اپنا خانۂ بے تکلف سمجھا اور بلا میزبان کی اطلاع تک کے مہمان بن بیٹھے۔ نائب قنصل صاحب کا ملازم ایرانی آدمی تھا۔ اس سے میں نے ساری کیفیت بیان کی۔ اس نے بھی یہی کہا کہ اب رات زیادہ ہو گئی ہے آپ لوگ یہیں رہیے۔ نائب قنصل صاحب نہایت بھلے مانس آدمی ہیں۔ آپ لوگ ان سے مل کر خوش ہوں گے۔ یہ آدمی نہایت شائستہ تربیت یافتہ اور ہوشیار تھا۔ اس نے ہم دونوں کو میزبان کی عدم موجودگی ہی میں کھانا کھلایا اور پلنگوں پر بستر بچھا کر آرام سے سلا دیا۔ نائب قنصل صاحب سے ہماری ملاقات صبح کو ہوئی۔ حقیقت میں وہ نہایت شریف آدمی ثابت ہوئے انھوں نے ہم دونوں کو ایک شب و روز اور مہمان رکھا اور چونکہ ان کو عربی فارسی سے بھی شوق تھا اس لیے مجھ سے ان سے خاص لطف کے ساتھ باتیں ہوا کیں۔ دوسرے روز ہم اُن سے رخصت ہو کر اپنے جہاز پر آئے۔ یہ محض اتفاق کی بات ہے کہ اس مکان میں ہمارا ناخواندہ مہمان بن کر آنا اور پھر نو برس بعد خواندہ مہمان ہونا دونوں ایک ہی تاریخ یعنی ۲۶ / اگست کو واقع ہوا۔

سالار معظم

زمانہ قیام بوشہر میں ریزیڈنسی کی وساطت سے ایک روز ہم لوگ سالار معظم گورنر بوشہر و جزائر خلیج فارس سے شرف اندوز ملازمت ہوئے۔ آپ شاہی قلعہ میں رہتے ہیں جو سمندر کے کنارے واقع ہے۔ قلعہ کی عمارت بظاہر مستحکم ہے لیکن بہت قدیم ہونے کے آثار بھی نمایاں ہیں۔ قلعہ کے دروازہ پر شاہی جھنڈا لہراتا تھا اور سپاہیوں کا دستہ موجود تھا۔ قلعہ کے اندر پہلے ہم ایک کمرے میں بٹھلائے گئے۔ پھر سالار معظم کی خدمت میں باریاب ہوئے۔ جن کمروں میں اب تک ہمارا گزر ہوا تھا وہ مشرقی

ترکیب سے قالین و تکیہ وغیرہ سے آراستہ تھے، لیکن اس کمرہ میں جہاں سالار معظم تشریف فرما تھے، قالینوں کے اوپر کرسیاں بچھی ہوئی تھیں، بیش قیمت پردے لٹک رہے تھے اور چاروں طرف مغربی تہذیب کا جز غالب نظر آرہا تھا۔ سالار معظم سے ملاقاتی ہونے کے وقت ہم سب نہایت ادب سے تسلیم کے لیے خم ہوئے۔ محتشم الیہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ جواب سلام دیا، مصافحہ کیا اور اپنے پاس کی کرسیوں پر جگہ دی۔ ہم نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا جس کو انھوں نے نہایت دلچسپی سے سنا۔ تادیر کالج کے حالات پوچھتے رہے اور ہمارے مقاصد سے پوری ہمدردی کا اظہار کیا، اپنے صاحبزادوں کی نسبت فرمایا کہ وہ بیلجیم میں تحصیل علم کر رہے ہیں لیکن اور عمائد کی نسبت فرمایا کہ اگر وہ اپنے لڑکوں کو علی گڑھ بھیجنا چاہیں گے تو نہ صرف ان کو اجازت ہی دی جائے گی بلکہ ان کے لیے ہر طرح کی سہولت بہم پہنچائی جائے گی۔

حمام

ایرانیوں کی ضروریاتِ زندگی میں حمام بھی داخل ہے۔ ہر ایرانی شہر میں ان کی ایک معقول تعداد آبادی کے لحاظ سے ہوا کرتی ہے۔ اکثر مردانہ حمام جدا اور زنانہ جدا ہوتا ہے۔ لیکن جہاں ایسا نہیں ہوتا، وہاں مردوں اور عورتوں کے لیے علاحدہ علاحدہ دن یا وقت مقرر ہوتے ہیں۔ حمام میں کئی درجہ ہوتے ہیں جن میں سے ہر اندرونی درجہ بیرونی درجے کے بہ نسبت زیادہ گرم ہوتا ہے۔ اسی باعث سے لوگ ہر ہر درجہ میں تھوڑی تھوڑی دیر ٹھہرتے جاتے ہیں تاکہ یکایک سردی سے گرمی میں آجانے پر نقصان نہ ہو۔ آخری درجہ کو طے کرنے تک آدمی پسینہ پسینہ ہو جاتا ہے، سارے مسامات کھل جاتے ہیں۔ حوض گرم پانی اور سرد پانی دونوں کا موجود ہوتا ہے، جن میں ہر شخص اپنی مرضی کے

مطابق نہا سکتا ہے۔ بدن کے ملنے والے بھی خدمت کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ اور غسل کے متعلق باقی ہر طرح کی ضروریات موجود ملتی ہیں۔ حمام کے اندر جو چیز ہمارے خیال کے مطابق سخت بے شرمی کی تھی وہ اکثر ایرانیوں کا بغیر کسی لُنگ کے محض برہنہ ادھر ادھر پھرنا تھا۔ بدن کے ملنے والے بھی اس کے عادی ہوتے ہیں کہ جسم کا کوئی حصہ ان کی دست مال سے باقی نہ بچے۔ بوشہر کے حمام میں ایک دن ایک مزے کا واقعہ پیش آیا۔ میں بیٹھا ہوا حجامت بنوا رہا تھا اور حجام اپنے کام میں مشغول تھا کہ یکایک اس نے اپنے ایک ساتھی کو آواز دی "حبیب، تیغ من از سر طاقچہ بیار۔ موہائے آغا خیلے سخت اند"۔ میں نے دل میں کہا کہ یا اللہ یہ تیغ کیوں منگاتا ہے کیا سچ مچ میرا سر ہی تراش دے گا (ایران میں حجامت کروانے کو سر تراشیدن کہتے ہیں)۔ لیکن جب وہ لے کر آیا تو صرف ایک استرہ تھا، معلوم ہوا کہ استرہ کا لفظ وہاں کوئی جانتا بھی نہیں۔ استرہ کو تیغ ہی کہتے ہیں۔

ایسے حمام میں ایک صاحب ہم کو گچ کے فرش پر نہایت آرام سے سوتے نظر آئے۔ اس روز تقریباً دو گھنٹے تک ہم کو حمام میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ یہ صاحب برابر اسی طرح ایک حالت سے آرام کرتے رہے۔ جب ہم حمام سے واپس آیا چاہتے تھے تو انھوں نے ذرا کروٹ بدلی۔ چادر کا پلہ منہ سے ہٹایا اور ہم کو دیکھ کر اٹھ بیٹھے ان کے اٹھنے کے بعد ہم نے پہچانا کہ یہ وہی ایرانی بزرگ ہیں جو جہاز پر ہمارے ہم سفر تھے۔ اپنے تئیں سالار معظم کا مصاحب خاص بتاتے تھے، اور جنھوں نے ہم کو بوشہر میں ہر طرح کی مدد دینے کا وعدہ کیا تھا۔ ہم کو ان سے کسی قسم کی ضرورت نہیں ہوئی۔ لیکن ہم ان سے ملنا ضرور چاہتے تھے۔ جب ہم لوگ سالار معظم سے ملنے گئے تھے تو قلعے میں ان بزرگوں کی شکل دکھائی دی تھی مگر صاحب سلامت کی نوبت نہیں آئی تھی۔ آج ہم کو یہ یہاں اتفاقاً مل گئے تو بات چیت کی گئی۔ اثنائے گفتگو میں ہم نے یہ دیکھا کہ ہم سے مل کر یہ خوش نہیں ہوئے بلکہ اور شرماتے تھے اور کسی

بہانہ سے جلد چل دیے۔ ان کے جانے کے بعد ہم نے وہاں کے آدمیوں سے ان کی بابت دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ حضرت والا قلعے کے کسی افسر کے معمولی خدمتگار ہیں۔

بعض علما کی ملاقات

زمانہ قیام بوشہر میں میرا معلوم تھا کہ نماز مغرب کی مسجد میں جاکر باجماعت ادا کرتا تھا۔ علاوہ نماز کے پڑھنے کے یہ بھی مقصود تھا کہ علما کے گروہ سے بھی کچھ روشناسی ہو اور کچھ حالات ان کے بھی معلوم ہوں۔ مسجد میں آنے والے ہندوستان کی طرح طبقہ ادنیٰ کے لوگ آیا کرتے تھے۔ علما اپنے اثر کے روز بروز کم ہوتے جانے کی شاکی تھے۔ بعض فقہ و اصول کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ تعلیم انگریزی کے زیادہ مخالف نہیں تھے۔ ہمارے مقاصد کو سن کر ان حضرات نے پسند کیا اور ایرانی لڑکوں کے یورپ جانے سے ہندوستان کے مدرسۃ العلوم مسلمانان میں آنے کو ہر طرح ترجیح دیتے تھے۔

روزنامہ مظفری

بوشہر سے ایک اخبار بھی فارسی زبان میں نکلتا ہے جس کا نام روزنامہ مظفری[۶] ہے۔ ایران میں اخبار کو روزنامۂ مظفری کہتے ہیں۔ اور لفظ اخبار اپنے لغوی معنوں میں مستعمل ہے۔ روزنامۂ مظفری کے ایڈیٹر نذیر الحق صاحب سے بھی ہماری ملاقات ہوئی، ہم نے ان کا دفتر بھی جاکر دیکھا۔ مطبع ایک مختصر سے تنگ ہال میں تھا۔ یہ ہفتہ وار اخبار ہے اور ایران میں جو اب تھوڑے زمانے سے کچھ بیداری کے آثار نمایاں ہیں اس کا یہ بھی ایک نمونہ ہے۔ ابھی تو بالکل ابتدائی حالت ہے۔ اشاعت بھی محدود ہے لیکن امید ہے کہ شاید کبھی قوم زیادہ متوجہ ہو۔ خود ایڈیٹر صاحب خاصے باخبر اور معلومات کے آدمی

ہیں حالانکہ انگریزی سے زیادہ واقفیت نہیں رکھتے۔ انھوں نے اپنے اخبار کی اشاعت کے بموجب ہمارے وفد کے متعلق اچھے خیالات کو ملک میں پھیلایا۔ اس طرح ہمارے شیراز پہنچنے سے پہلے ہماری آمد کی خبر وہاں پہنچ لی تھی۔

بنک [بینک]

بوشہر میں پرشین بنک کے نام سے ایک انگریزی بنک بھی ہے۔ اس کی عمارت بڑی اور شاندار ہے۔ اور وہاں کاروباری لوگوں کی ہر وقت آمد و رفت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بنک کا اچھا اعتبار ہے اور اس کا کام خوب چلتا ہے۔ یہ اس بڑے بنک کی شاخ ہے جو شیراز میں ہے۔ ہم نے راہ کے خطرہ کی وجہ سے اپنا زاید روپیہ یہاں جمع کر دیا اور وہ ہم کو برابر شیراز میں بلا دقت ملتا رہا۔ اس خدمت کے معاوضہ میں جو ہم کو دینا پڑا وہ ہماری سہولیت کے لحاظ سے بہت تھوڑا تھا۔ اس بنک کے ایک عہدہ دار مرزا محمد جواد صاحب ایرانی کے پاس ہماری سفارش کا خط شیراز سے آچکا تھا۔ ان بزرگ کے ذریعے سے ہم کو ہر طرح کی سہولت ہوتی تھی۔

بوشہر سے شیراز کو روانگی

بوشہر میں ہم لوگوں کا قیام صرف تین روز ہوا۔ لیکن واپسی میں مجھ کو دو ہفتہ رہنا پڑا اور کسی قدر اور حالات معلوم ہوئے جو اپنے موقع پر بیان کیے جائیں گے۔ روانگی شیراز کے متعلق کل انتظام ہمارے لیے ریزیڈنسی کے ذریعے سے ہوا ہے۔ خود ہم لوگوں کو کسی طرح کی زحمت نہیں اٹھانی پڑی۔ سواری کے واسطے قاطر یعنی خچر کرایہ پر لیے گئے اور ہم لوگ ۲۸/ اگست کی شام کو روانہ ہوئے۔ بوشہر سے شیراز جانے میں پہلی منزل شیف آتی ہے۔ یہاں پہنچنے کے دو راستے ہیں۔ ایک خشکی کے ذریعے

سے جو سولہ سترہ میل کی مسافت ہے اور دوسرا راستہ سمندر کے ذرا سے ٹکڑے کو عبور کر کے جو گھنٹے دو گھنٹے میں طے ہو جاتا ہے۔ لیکن چونکہ قاطر وغیرہ کا انتظام بوشہر ہی میں کیا جاسکتا ہے اور شیف ایک بالکل غیر آباد مقام ہے اس لیے علی العموم متوسط لوگ خشکی ہی کے راستے جاتے ہیں۔ مسٹر اسکوئرا وائس قونصل نے ہمارے ساتھ یہ مزید مراعات کی کہ سرکاری دخانی کشتی ہمارے لیے بھیج دی جس پر نہایت آسانی سے بہ آسائش تمام ہم شیف آگئے۔ یہ ایسا غیر آباد بنجر مقام ہے کہ یہاں پینے کے لیے پانی بھی میسر نہیں آتا۔ اس جگہ ایک مبتذل سا قہوہ خانہ ہے جہاں چائے اور قہوہ نہایت گراں قیمت پر مل سکتا ہے۔ ہمارے قاطر چی جو یہاں پہلے سے موجود تھے آدھی رات کے قریب آگے پیچھے سب روانہ ہوئے۔

ایران میں سفر کی پہلی رات

شیف کے مقام پر کھاپی کر ہم ابھی بیٹھے تھے، کوئی سو گیا تھا، کسی کو نیند آیا ہی چاہتی تھی کہ ہمارے قاطر چی نے جو وہاں چروہ دار (یعنی چاوا جانور) کہلاتا ہے "پاشو آغا پاشو" کی پکار مچادی۔ ایسے وقت اٹھتے میں جس قدر جبر ہوتا ہے وہ ظاہر ہے لیکن کیا کرتے۔ سفر کے شروع کرنے اور ختم کر دینے کا اختیار بالکل اس کے ہاتھ میں تھا۔ اور ہونا بھی چاہیے تھا۔ آخر کار بادل ناخواستہ اٹھے۔ چروہ دار نے جلدی جلدی سب کا بستر باندھا اور ساتویں رات کا چاند غروب ہونے کے قریب تھا کہ وہ سب کو لے کر چل کھڑا ہوا۔ ہماری جماعت میں سے میر ولایت حسین صاحب اور سید ابو محمد صاحب کجاوہ میں سوار تھے۔ جمیل الزماں صاحب اور میں خچروں پر لدھے ہوئے تھے۔ اسباب سے ایک سید صاحب کہ جن کو کربلائے معلیٰ کی زیارت کے اشتیاق نے ملازم کے طور پر چلنے کے لیے آمادہ کر دیا تھا، وہ اور خچروں پر بار تھا۔ چروہ دار اور اس کا دوازدہ سالہ لڑکا تھا۔ ایک گدھا تھا، جس پر یہ باپ بیٹے باری باری سے سوار

ہو لیتے تھے اور اس زندگی کے ایسے عادی تھے کہ گدھے پر بے تکلف ہاتھ پاؤں لٹکا دیتے اور مزے سے سوتے چلتے تھے۔ شروع میں نیند مجھ پر بھی غالب تھی اور جھومتا جھامتا چلا جارہا تھا لیکن ایک آدھ مرتبہ قبر بوس زمین پر ایسی بری طرح سر بسجود ہوا کہ آنکھیں کھل گئیں۔ دوسرے مجھ کو اپنی سواری سیکھنے کا زمانہ یاد تھا۔ تین ہی سال پہلے کی بات تھی کہ مکان سے جب کبھی میں گھوڑے پر سوار ہو کر باہر جاتا تھا تو جانے کے وقت تو ہمارا اور جانور کا ساتھ ہوتا تھا۔ لیکن واپسی میں پیشتر مجھ کو تنہا ہی آنا پڑتا تھا۔ میری معیت کو صحبت ناحق سمجھ کر مجھ سے اپنا پیچھا چھڑا لیتا اور گھر پر زقند بھرتا پہلے آن پہنچتا۔ میں جھاڑ تا پونچھتا سر جھکائے خراماں خراماں بہت پیچھے آتا۔ اب بھی میری شہسواری میں پہلے سے کچھ فرق نہیں آیا تھا لہٰذا اگر نیند آتی بھی تھی تو میں بہ کوشش اس کو ٹالتا تھا۔ چنانچہ اسی غرض کے لیے میں نے بے تال سر کا گانا شروع کر دیا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلی رہی تھی۔ ماہتاب افق مغرب میں پہنچ لیا تھا۔ اس کی ترچھی کرنیں ترچھی نظر کا کام دے رہی تھیں۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ سوا ٹاپوں کی آواز اور بعض وقت چرہ دار کی ٹخ ٹخ کے کوئی صدا بلند نہ ہوتی تھی۔ میرے ہم نشین ساتھی تو سوتے تھے اور سر نشین ساتھی بھی نیم خفتہ سے زیادہ بیدار نہ تھے۔ میں ہی گاتا تھا۔ میں ہی سنتا تھا۔ اور میں ہی داد دیتا تھا۔ خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ، یہ کیفیت مجھ پر تادیر رہی یہاں تک کہ میری لوریوں سے شب کی ملکہ کو نیند آگئی اور اس نے چہرہ پر نقاب ڈال کر سر سے چادر تان لی اور پہاڑوں کی اوٹ میں جا آرام لیا۔ خواصان انجم کا جھرمٹ محفل کو خالی پا کر خوب چمکا، آپس میں چشمکیں ہوئیں۔ کوئی ٹوٹا کوئی پھوٹا کوئی آیا کوئی گیا۔ سب نے پھر محفل آسمان کو گرم کرنا چاہا، لیکن جن لوگوں نے ابھی چند منٹ پہلے ملکہ کی آن بان دیکھی تھی ان کی نگاہوں میں تو دنیا اندھیری تھی۔ چنانچہ میں نے بھی اپنے ترانے بند کیے، اور اپنے خیالات میں ایسا محو ہوا کہ جاگنے میں خواب کے مزے لینے لگا۔

شیف سے چلتے ہی تقریباً میل ڈیڑھ میل پر یہ واقعہ ہوا

میں اپنی خواب بیداری کے مزے لے رہا تھا کہ "السلام علیکم آغا" کی آواز نے مجھ کو چونکا دیا۔ پھر دیکھتا ہوں تو دو ایرانی بندوق کاندھے پر رکھے ساتھ ساتھ چلے آرہے ہیں۔ پہلے تو میں ڈرا کہ شاید یہ کوئی لٹیرے ہیں۔ لیکن انھوں نے خود ہی میرے خوف کو دور کر دیا اور بتایا کہ ہم لوگ تفنگچی ہیں۔ مسافروں کی حفاظت کے لیے متعین ہیں۔ یہاں تک تو بہت اچھی بات تھی۔ اس کے بعد انھوں نے بخشش طلب کرنی شروع کی۔ میں پہلے ان سے بحث کرتا رہا لیکن جب وہ نہ مانے تو میں نے اپنا پیچھا چھڑانے کے لیے کجاوہ کی طرف اشارہ کیا کہ ہمارے افسر اس میں بیٹھے ہوئے ہیں ان سے جا کر مانگو۔ چناچہ وہ میر صاحب کے پاس پہنچے۔ میرے صاحب کچھ تو حقیقت میں سو گئے تھے اور کچھ ہماری بحث سن کر شاید سوتے بن گئے۔ اس لیے پہلے تو تفنگچی دیر تک چلایا کیے اور ادھر سے صدائی برنخواست۔ مگر وہ ایسی کچھ کچی گولیاں کھیلے نہیں تھے کہ اتنے ہی میں ہار بول دیتے۔ انھوں نے دیکھا کہ وہاں تو مُردوں سے شرط بندھی ہوئی ہے اور ان کی آوازیں صورِ اسرافیل کا مقابلہ نہیں کر سکتیں تو انھوں نے ہاتھ سے جھنجھوڑنا شروع کیا۔ اب سوتے رہنے اور چپ بیٹھنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ چنانچہ سید محمد ابو محمد صاحب نے جو میر صاحب کے ساتھ تھے، اس حربہ سے کام لینا چاہا کہ ہم لوگ غیر ملک کے آدمی ہیں تمہاری زبان نہیں سمجھتے۔ اور بڑی دیر تک ان کی باتوں کا اوٹ پٹانگ جواب اردو میں دیتے رہے۔ اس پر وہ بڑے بھنائے اور پدر سگ پدر سوختہ اور جو کچھ جی چاہا کہتے رہے۔ لیکن گالیوں کے میدان میں بھلا ہندوؤں کے سامنے کون ٹھہر سکتا ہے۔ ایسے دو چار پدر سگ پدر سوختہ کے چھرّوں سے کیا ہوتا ہے۔ ہمارے میگزین میں تو گالیوں کے بم کے گولے تک موجود تھے اگرچہ ان کے استعمال کی ضرورت نہ تھی اور حقیقت یہ ہے کہ ان کا استعمال ہمیں آتا بھی نہ تھا۔ ہم نے الو، گدھا، پاجی، سور سے شروع

کر کے الو کا پٹھا اور سور کے بچے تک ہی ترقی کی تھی کہ وہ دھیمے پڑ گئے۔ ہماری آواز ان کی آواز پر قدرتاً بلند نہ ہوتی تھی کیونکہ ہم ڈر رہے تھے۔ لیکن معلوم نہیں انھوں نے ہماری گالیوں کا کیا مطلب سمجھا کہ وہ چپ ہو گئے۔ اب دونوں طرف خاموشی محض تھی۔ اگرچہ میں سمجھ رہا تھا کہ ہوا کا بند ہو کر ایسا سخت حبس ہو جانا بڑی آندھی کی علامت ہے۔ چنانچہ تھوڑی دیر کی صلاح مشورہ کے بعد انھوں نے آکر میرے خچر کی باگ پکڑی اور بولے کہ جب تک تم ہم کو کچھ نہ دو گے ہم جانے نہ دیں گے۔ میرے ساتھی اور کجاوے والے تھوڑا آگے بڑھ گئے تھے۔ میں ڈرا اور میں نے چروہ دار کو آواز دی۔ بارے وہ آیا لیکن اس کی جرات نہ پڑی تھی کہ وہ ہماری حمایت کرے۔ آخر کار مجبوراً میں نے چروہ دار سے کہا کہ تم اپنے پاس سے ان کو کچھ دے کر راضی کر دو۔ ہم منزل پر پہنچ کر تم کو واپس دے دیں گے۔ چنانچہ اس نے دو قران (تخمیناً تیرہ آنہ) ان کی نظر کیے اور میری مخلصی کرائی۔ میرے پاس خود بھی اتنی بلکہ اس سے بہت زائد رقم موجود تھی کیونکہ اس وفد کا خزانچی میں ہی تھا۔ لیکن میں ڈرتا تھا کہ اگر انھوں نے میری جیب میں سکوں کی آواز سنی یا کمر بند سے کچھ نکالتے دیکھا تو ان کے دندان آز کی درازی کی حد نہ رہے گی۔ بلکہ اس قدر قیل و قال اور آخر تک پیسوں کو دانت سے پکڑے رہنے کا سارا مطلب ہی یہی تھا کہ یہ لوگ ہمیں بڑا آدمی نہ سمجھیں۔ ورنہ کون نہیں جانتا کہ دہن سگ دوختہ بہ۔ ان باتوں کے یاد کرنے سے اب تو خاصہ لطف آتا ہے لیکن اس وقت ایسا مزہ کرکرا ہوا تھا کہ باقی تمام سفر میں مجھ کو آسمان پر نہ شب کی ملکہ نظر آئیں اور نہ خواصان انجم کا جھرمٹ دکھائی دیا۔ اور نہ کبھی پھر اپنے ترانے بھول کر بھی یاد آئے۔

ایران اور عرب کے سفر کا کچھ مقابلہ

ایران کے اکثر راستوں میں چونکہ آمد و رفت کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ اس لیے وہاں سفر کرنے کے لیے عرب کے سفر کی طرح اس امر کی ضرورت نہیں ہوتی کہ سو، سوا سو کا قافلہ اکٹھا ہو کر چلے۔ یہاں پانچ سات آدمی بھی چل کھڑے ہوتے ہیں اور راستے میں برابر آتے جاتے ہوئے مسافر ملتے رہتے ہیں اور اسباب تجارت ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر ہوتا نظر آتا ہے۔ دوسری وجہ زیادہ احتیاط نہ کرنے کی غالباً یہ بھی ہوگی کہ عرب کے سخت دل بدوؤں کی طرح ایران کے دیہاتی ہر وقت چند پیسوں کے لیے مسافروں کو عدم آباد پہنچا دینے پر تلے نہیں رہتے۔ ہاں کوئی اکا دکا مسافر موقعے سے مل جائے تو اس کا اسباب سارا چھین لینے اور اس کو لخت چھوڑ دینے میں بھی نہیں چوکتے۔ خیر یہاں مسافر ''جان بچی لاکھوں پائے'' تو کہہ سکتا ہے۔ میں نے اوپر تفنگچیوں کی شرارت کا حال لکھا ہے۔ عیب می جملہ بہ گفتی ہنرش نیز بگو۔ اس میں شبہ نہیں کہ تفنگچی ایسے مسافروں سے جو دے سکتے ہوں، کچھ نہ کچھ ضرور لے مرتے ہیں، لیکن اس کے معاوضہ میں ان کا راستے کے اور لٹیروں سے محفوظ رہنا تھوڑی بات نہیں۔ مخدوش مقامات پر خصوصاً ان کے رہنے کے جھونپڑے بنے ہوئے ہیں اور ان کو اگر خوش رکھا جائے تو کسی قسم کی اذیت نہیں ہوتی۔ اپنا ٹیکس جبریہ وصول کرنے میں بھی یہ بیچارے خود حق بجانب ہیں۔ برائے نام تین چار روپے ماہوار کے ملازم ہیں اور وہ تنخواہ بھی چھ چھ مہینے اور سال سال بھر گورنمنٹ کے ذمے واجب الادا رہتی ہے۔ پھر اب بیچارے مسافروں سے وصول نہ کریں تو کیا کریں۔ رہا ان کی گورنمنٹ کی خوش انتظامی کی جھلک جو اس موقعے پر نظر آتی ہے سو اس سے میں سر دست قطع نظر کرتا ہوں۔ عرب کے منزلوں پر ان خوش قسمت مقامات کے علاوہ جہاں سے نہر زبیدہ گزرتی ہے پانی کا بہم پہنچانا گویا جوئے شیر کا لانا ہے۔

ایک بے انتہا عمیق کنواں ہوتا ہے جس کے گرد بلا مبالغہ ایک وقت میں سینکڑوں آدمیوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ پیاسے اونٹوں کی قطاریں اپنے اپنے پیٹ کی دہری دہری مشکیں پی لینے اور رکھ

چھوڑنے کے لیے الگ بلبلاتی رہتی ہیں۔ ایسا غل اور شور ہنگام اور فساد برپا رہتا ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ پانی مل تو سب کو جاتا ہے لیکن اس سے قبل آدمی کا سارا بدن پانی پانی ہو کر بے تکلف بہنا شروع ہو جاتا ہے۔ پانی کی مہم کے بعد جلانے کی لکڑی کے لیے خاک سے تنکے چھاننے اور چننے پڑتے ہیں۔ ایران کی منزلوں پر مختصر لفظوں میں یہ ہے کہ ضروریاتِ زندگی سب میسر ملتی ہیں۔ دن کی دھوپ یا رات کی اوس سے بچنا ہو تو کارواں سرائے یا گھنے باغ مسافروں کو خوش آمدید کہتے رہتے ہیں۔ عرب میں منعموں کا ذکر نہیں جو ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت [۸] کے مصداق ہیں۔ عام مسافروں کو جلتی جلتی ریت کا فرش اور نیلی طبق کا خیمہ نظر آتا ہے اور بس۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ایران کی کسی چیز کا عرب سے مقابلہ کرنا (خوش اعتقادی کو چھوڑ کر) ایران پر ستم کرنا ہے۔ لیکن کیا کہا جائے، کنویں کے مینڈک کی طرح بد قسمتی سے میری دنیا ہندوستان کے بعد انھیں دو ملکوں پر ختم ہو جاتی ہے۔

بوشہر اور شیراز کے درمیان کی بعض منزلیں، برازگان

شیف سے نصف شب کو روانہ ہو کر ہم لوگ دوسرے دن ۱۰/ بجے برازگان پہنچے۔ یہ منزل ۸ فرسخ یعنی ۲۴ میل کی تھی۔ اور تقریباً دس گیارہ گھنٹے میں تمام ہوئی۔ راہ میں تھوڑی دیر کے لیے نماز صبح کے واسطے ہم لوگ رک گئے تھے ورنہ برابر چلتے ہی رہے۔ رات کو تفنگچیوں کے انعام دینے میں جو ہم نے بڑی حجت کی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے چروہ دار نے ہم کو بالکل نادار فرض کر لیا اور راستے میں ہر شخص سے جو ہماری نسبت سوال کرتا تھا بتا دیتا تھا کہ "چند ملاے ہندی ہستن (ہستند) لغت فرنگی یاد گرفتن (گرفتہ اند) ہندان (نان) نہ یافتن (یافتند) شیر از میرند (میروند)۔" اس سے تو ہم خوش تھے کیونکہ پہلا حصہ اس کے بیان کا درست بھی تھا۔ ہم میاں جی تو تھے ہی۔ ٹوٹی پھوٹی انگریزی بھی جانتے

ہی تھے ہاں اپنے گھر روٹیوں کے محتاج نہ تھے اور نہ شیر از کھانے کمانے جاتے تھے۔ پھر بھی ہمیں کیا پڑی تھی کہ خواہ مخواہ اس بیان کی تردید کرتے۔ البتہ اگر کوئی ہم سے خود منہ پھوڑ کر ہمارے شیر از جانے کی وجہ پوچھتا تو ہم اصل امر بتا دیتے۔ لیکن ان دیہاتیوں کو یقین نہ آتا وہ لوگ صاف کہتے کہ تم لوگ انگریز ہو اور ایران میں جاسوس بن کر آئے ہو۔ ہمیں جہاں ان کی اس ہوشیاری پر تعجب آتا تھا کہ وہ اجنبی آدمیوں کو جاسوس ہی سمجھتے ہیں وہاں اس بات پر ہنسی بھی آتی تھی کہ وہ ہم لوگوں کو جن میں علاوہ میرے سب پکے رنگ والے حضرات تھے، یہ دیہاتی انگریز جانتے تھے۔ براز گان میں باوجودے کہ عمدہ کاروانسرا موجود ہے لیکن ہمارے چر وہ دار نے ہم کو نادار محض سمجھ کر ایک دوسرے چر وہ دار کے ہاں پر لا ٹھہرایا۔ یہاں ایک چھپر کے نیچے ہم کو دن بسر کرنا پڑا۔ لوہ ایسی سخت چلتی تھی کہ پناہ بخدا۔ سارا دن کمبل کی آڑ کر کے ہم لوگ پڑے رہے۔ ایسی سخت لوہ کا مجھ کو ہندوستان میں بھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اور اس غیر محفوظ مکان نے اس کی سختی کو دوچند کر کے ظاہر کیا تھا۔

روٹی کے پکانے کا طریقے ہم نے یہاں بالکل عجیب دیکھا۔ ہمارے ہندوستان میں معمولی طریقہ توے پر روٹی پکانے کا یہ ہے کہ ایک ایک کر کے روٹی پکائی جاتی ہے۔ مختلف مقامات میں روٹی کی دبازت میں البتہ فرق ہوتا ہے۔ اس مقام پر ہم نے دیکھا کہ توے پر ایک روٹی ڈالی پھر اسی پر دوسری پھر تیسری۔ اسی طرح روٹی پر روٹیوں کا خاصہ انبار لگ جاتا ہے۔ کسی روٹی کو الٹنے یا پھیر پھار کرنے کی مطلق ضرورت نہیں ہوتی۔ روٹیاں اتنی پتلی ہوتی ہیں کہ اس سے زائد پتلی خیال میں نہیں آسکتی۔ وزن کے حساب سے بکتی ہیں اور راستے کے لیے تہ کر کے رکھ لی جاتی ہیں۔ یہ سوکھ کر بہت سخت ہو جاتی ہیں۔ کھانے کے وقت ان پر پانی ڈال دیا جاتا ہے پھر یہ خاصی نرم ہو جاتی ہیں۔

دالکی

براز گان سے نصف شب کے قریب روانہ ہو کر علی الصباح نماز کے وقت دالکی پہنچے۔ چونکہ یہ منزل صرف ۵ فرسخ (۱۵ میل) کی تھی اس لیے زیادہ دیر نہیں لگی۔ بیرون قصبہ ایک نہایت پر فضا اور شاداب باغ میں جس کے اندر قدرتی چشمہ رواں تھا، ٹھہرے۔ دوپہر کے وقت اس مقام پر بھی گرمی اور لوہ سے اذیت اٹھائی لیکن براز گان کے مقام سے نسبتاً تکلیف کم ہوئی۔

دالکی سے ہم لوگ دو گھڑی رات گئے روانہ ہوئے۔ میں اپنے خچر پر ابھی بیٹھا ہی تھا کہ اس نے دوسرے خچر کو ایک لات رسید کی۔ شاید اس دوسرے خچر کے کچھ چوٹ آئی ہو یا نہ آئی ہو لیکن میں بے تکلف نیچے آرہا۔ جھاڑ پونچھ کر ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ کسی نے دیکھا تو نہیں کہ چروہ دار نے پیچھے سے آواز دی، ”زمین خوردی! عیب ندارد سواراں می افتند“۔ میں نے اسی کو غنیمت سمجھا کہ اس تماشہ کا دیکھنے والا ایک ہی آدمی تھا۔ اور پھر جلدی سے آکر خچر پر لد گیا۔ اس منزل کی ابتدا ہی سے پہاڑ پر چڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔ ہم سب پیادہ روانہ ہوئے لیکن عادت نہ ہونے کے سبب سے تھوڑے ہی راستے میں میں اتنا چور ہو گیا کہ مجھ کو سید ابو محمد صاحب سے جگہ بدل کر کجاوہ میں بیٹھنا پڑا اور دو راتیں متواتر جاگتے رہنے اور دن کو سخت گرمی اور لوہ کی اذیت اٹھانے کے باعث مجھ کو تبخیر ہو گئی۔ رات کا باقی حصہ میں نے غفلت میں کاٹا صبح صادق کے وقت جب میری آنکھ کھلی تو ہم پہاڑ کے اتار چڑھاؤ کو طے کر چکے تھے اور مسطح زمین پر رواں تھے۔ دور سے مرغوں کے بانگ کی دلکش آواز آرہی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ بستی قریب ہے۔ لیکن بستی تک پہنچتے پہنچتے دن نکل آیا۔ بستی جس کا نام کنار تختہ تھا، بڑی معلوم ہوتی تھی۔ یہاں ہمارے چروہ دار نے منزل نہیں کی بلکہ دو گھنٹے اور چل کر چورون کے مقام پر آکر ٹھہرا۔

چورون

چورون ایک چوڑے چشمے کے کنارے آباد ہے۔ آبادی محض آٹھ دس گھروں کی ہے جس میں تفنگچی رہتے ہیں۔ انڈا، مرغی اور روٹی کے ملنے میں یہاں بھی کوئی دقت نہیں ہوئی۔ چشمہ نہایت صاف و شفاف سرد اور شیریں پانی کا ہے۔ چاروں طرف سر بفلک کشیدہ پہاڑ کھڑے ہیں۔ مقام خاصا فرحت بخش ہے۔ یہاں نہ سردی ہے نہ گرمی۔ دوپہر کے وقت ہوا ذرا گرم ہو جاتی ہے لیکن نہ ایسی جس سے تکلیف پہنچے۔ یہاں ہم لوگ خوب نہائے دھوئے اور خوش و خرم رہے۔ شب کو جو کسل ہو گیا تھا، وہ دور ہو گیا۔

یہاں سے ہم سرشار روانہ ہوئے۔ چونکہ یہ بستی تفنگچیوں ہی کی تھی، اس لیے ابتدا ہی سے یہ حضرات ہمارے ساتھ ہو لیے۔ ہم بھی اب ان کے عادی ہو گئے تھے اور راہ میں برابر ہر شب کو ٹکس ادا کرتے چلے آتے تھے۔ روانگی سے تھوڑی ہی دیر کے بعد پہاڑ کی چڑھائی شروع ہو گئی۔ اس کی چڑھائی نہایت سخت تھی اور اتار اس سے بھی زیادہ مشکل۔ ہر ہر قدم پر گرنے کا خوف رہتا تھا۔ لیکن وہاں چونکہ گرنے اور مرنے کے معنی برابر تھے اس لیے جس قدر احتیاط امکان میں تھی، کی جا رہی تھی۔ صبح کے وقت چڑھاؤ اتار سے نجات ملی اور کف دست میدان میں چار گھنٹے چل کر کارزان پہنچے۔

کارزان

کارزان بوشہر سے چھوٹا لیکن اچھا مختصر سا شہر ہے۔ گورنر بوشہر کا نائب یہاں رہتا ہے۔ کاروانسرا میں حمام، بازا، مسجدیں موجود ہیں۔ ضرورت کی ہر چیز آسانی سے ملتی ہے۔ علما، رؤسا، تجار اور ہر قسم کے لوگ ہیں۔ مکانات زیادہ تر خام ہیں۔ نواح میں باغات بھی اچھے ہیں۔ یہاں ہمارے چروہ دار نے ایک روز زائد قیام کیا اور اپنے جانوروں کو آرام دیا۔ یہاں تربوز اور خربوزہ بہت عمدہ ہوتا ہے۔

دوسرے روز سہ پہر کو ہم لوگ روانہ ہوئے۔ ۱۱/ فرسخ ہموار زمین طے کر کے قریب ایک چشمے کے کنارے پر آکر یہاں رکے۔ یہاں پہلے سے بھی ایک قافلہ ٹھہرا ہوا تھا اور بعد میں بھی کچھ لوگ آگئے۔ چند گھنٹے ہم نے یہاں قیام کیا۔ پھر روانہ ہوئے۔ اس رات کو دو پہاڑیوں پر سے گزر ہوا۔ صبح سویرے تھوڑا مسطح میدان طے کرنے کے بعد پھر ایک بڑے پہاڑ پر چڑھنا پڑا۔ پہاڑ کی نصف چڑھائی تک چڑھتے چڑھتے دن کے تقریباً دس بج گئے۔ اس جگہ ایک کاروانسرائے بنی ہوئی ہے۔ یہاں ہم نے قیام کیا۔ اس جگہ کوئی چیز کھانے پینے کی نہیں ملتی۔ پانی بھی پہاڑ کی اور زیادہ بلندی سے لانا پڑتا ہے، جو اتنی چھوٹی دھار سے بہتا ہے کہ ایک چھوٹے لوٹے کے بھرنے میں کئی منٹ لگ جاتے ہیں۔ یہ جگہ مہمان کو تل کے نام سے مشہور ہے۔ پہاڑوں کو یہاں کوتل ہی کہتے ہیں۔ ہم کو ایران میں جو پہاڑ ملے وہ کوتل ملے۔ کوتل پیرزن، کوتل اختر، کے نام سے موسوم تھے۔ ان کی وجہ تسمیہ معلوم نہیں ہو سکی۔

اسی روز چند گھنٹہ آرام کے بعد تین بجے سہ پہر کو ہم سب پھر روانہ ہوئے۔ پہاڑ کی چڑھائی میں میں اپنے ساتھیوں سے ذرا آگے چل رہا تھا۔ چڑھائی ختم ہونے کے بعد دو پگڈنڈیاں نظر آئیں۔ میں بلا اس خیال کے کہ یہ دو مختلف طرف جاتی ہوں گی، ایک پگڈنڈی پر ہو لیا کیونکہ پہاڑ پر اکثر کئی کئی راستے نظر آتے ہیں لیکن تھوڑے یا زیادہ فاصلے کے بعد وہ پھر آپس میں مل جاتے تھے۔ میرے ساتھی کسی قدر فاصلے پر تھے۔ میں نے ان کا انتظار نہیں کیا اور نہ اس کی ضرورت سمجھی۔ لیکن چلتے چلتے جب میں دور نکل گیا اور راہ کی پامالی کے نشان بھی دھندلے ہونے شروع ہوئے اور اپنے ساتھی یا کسی اور راہگیر کی صورت بھی نظر نہ آئی تو میں بہت گھبرایا۔ پھر تو برے خیالات کا ایک سمندر تھا کہ میرے دماغ میں موجیں مارنے لگا۔ یہ تو مجھ کو یقین ہو گیا کہ میں اصل راہ سے بھٹک گیا ہوں۔ لیکن یہ خیال بھی ہوتا تھا کہ شاید یہ غیر معروف راستہ بھی آگے چل کر اصل راہ سے مل جائے۔ چلتے چلنے میں یہ اندیشہ تھا کہ اگر یہ راستہ اصل راہ سے نہیں ملتا تو ہر ہر قدم پر میں اپنے ساتھیوں سے دور اور آفات سے قریب ہوتا

جاؤں گا۔ اور واپسی میں یہ دقت تھی کہ آفتاب کے غروب ہونے میں ایک گھنٹہ سے زائد باقی نہ تھا۔ میں میاں کوتل کی سرا تک نہ پہنچوں گا کہ دن چھپ جائے گا۔ لیکن میں نے اسی دوسری شق کو ترجیح دی اور نہایت افسردگی کے ساتھ پیچھے مڑا۔ خطرناک موقع نے مجھ میں تیزی پیدا کر دی اور میں جس قدر تیزی کے ساتھ اپنے خچر کو چلا سکتا تھا واپس ہوا۔ تخمیناً آدھا گھنٹے کی سرتوڑ رفتار کے بعد مجھ کو اپنا چروہ دار ملا جو مجھے تلاش کرنے آرہا تھا۔ مجھ کو دیکھ کر وہ بہت بپھرا اور جہاں تک اس کی زبان نے یاری دی، وہ مجھے برا بھلا کہتا رہا۔ لیکن اس کے دیکھنے سے میری جان میں جان آگئی تھی۔ میں اس کی گالیاں ٹھنڈے دل اور میٹھے کانوں سنتا رہا۔ میرے ساتھی میرے انتظار اور تلاش میں دیر سے پریشان تھے وہ حضرات بھی میرے مل جانے کی خوشی میں میری تلاش و انتظار کی تکلیف کو بھول گئے۔

دشت ارژن

آفتاب کے غروب ہونے کے وقت ہم پہاڑ سے نیچے اتر کر دشت ارژن میں داخل ہوئے۔ یہ ایک کف دست میدان میلوں کا لمبا چوڑا چلا گیا ہے اور چاروں طرف پہاڑوں سے محصور ہے۔ اس میں متعدد قدرتی چشمے بہتے ہیں۔ جہاں تک نظر کام کرتی تھی سبزی ہی سبزی نظر آتی تھی۔ جابجا بھیڑ بکریوں کا ریوڑ اور ان کے مالکوں کے ٹوٹے پھوٹے خیمے دکھائی دیتے تھے۔ اتفاقاً ہمارے یہاں سے گزرنے کا وقت خود نہایت ہی اچھا تھا، اس پر سے ہوا ٹھنڈی چل رہی تھی۔ سارا منظر ایسا دلفریب تھا کہ ہم میں سے اکثر پا پیادہ ہو گئے۔ دوسرے قافلے والوں میں سے ایک بوڑھے شیرازی پر لطافتِ ہوا کا ایسا اثر ہوا کہ اس نے وجد میں آکر گانا شروع کر دیا۔ شیراز کی تعریف میں اشعار پر اشعار اس الحان کے ساتھ گاتا تھا کہ خواہ مخواہ دل اس کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔

ایرانی گانا

ایرانیوں کے گانے کا طریقہ ہندیوں سے اور غالباً دوسرے ملک والوں سے بالکل مختلف ہے۔ گنگری ان میں بھی ہے لیکن ان کی آواز کا اتار چڑھاؤ، الفاظ کی کھینچ تان ان بے معنی لفظوں میں ختم ہو جاتی ہے جن کو کہ وہ اصل اشعار کے شروع کرنے سے پیشتر اور ختم کرنے کے بعد گاتے رہتے ہیں۔ لَدَ لَدَ کی آواز اپنے تال سر کے ساتھ گونجتی رہتی ہے۔ اس کے بیچ میں مناسب موقعے پر شعر کا ہر ایک مصرع علاحدہ علاحدہ صاف لفظوں میں کہہ دیا جاتا ہے جس کے سمجھنے میں بہت کم دقت ہوتی ہے۔ گانے کا مزہ معنی لَدَ لَدَ میں، اور معنی کا لطف صاف ستھرے اشعار میں دل پر پورا اثر کرتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ایرانیوں کا علم موسیقی ہندوستانیوں سے بڑھا ہوا یا ان کے برابر بھی ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ ہندوستانی گانے خصوصاً ہندی چیزوں کے سماع کے وقت ایک طرف تو کان کے ذریعہ سے داروئے بے ہوشی سرایت کرتا ہوتا ہے لیکن دوسری طرف فہم و ادراک کو اس کا اشتیاق رہ جاتا ہے کہ اس گانے کا مطلب کیا تھا۔ میں ہندی سے اتنا آشنا نہیں ہوں کہ اگر وہ میرے سامنے صاف طور پر پڑھی جائے تو میں اس کو سمجھ نہ سکوں۔ میری دانست میں ایرانی گانے کے وقت عقل و خرد پر دو طرفہ حملہ ہوتا ہے۔ محض آواز کی دلکشی اس کا اتار چڑھاؤ عقل کو ٹھکانے نہ رہنے دینے کے لیے کافی ہے۔ اس پر فہم و ادراک میں مطالب گھس کر آدمی کے رہے سہے حواس کھو دیتے ہیں اور عقل غریب بے کار ہو جاتی ہے۔ ہندی گانے پر میری نکتہ چینی اگر کسی فدائے ہندی موسیقی کو ناگوار گزری ہو تو میں معذرت کے لیے سچے دل سے حاضر ہوں۔ میں اس کوچہ سے محض نابلد ہوں اور حقیقت یہ بھی ہے کہ باوجود متذکرہ بالا اظہار خیالات کے خود مجھ پر جو بے سمجھے ہوئے ہندی گانے کا اثر ہوتا ہے وہ سمجھے ہوئے فارسی اشعار کے گانے کا نہیں ہوتا۔

ایضاً دشت ارژن

آٹھ بجے شب کے قریب ہم قصبے میں پہنچے۔ ہمارا چروہ دار یہاں بھی ہم کو کاروانسرائے میں نہیں لایا بلکہ اس نے ایک کچے مکان میں جو غالباً اس کے کسی بھائی برادری والے کا ہو گا لا ٹھہرایا۔

رشتہ در گردنم افگندہ دوست [۹]
می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

بوشہر سے روانہ ہو کر دو منزل یعنی دالکی تک تو لوہ اور گرمی کی وہ کیفیت تھی کہ الامان۔ لیکن پہاڑ کی چڑھائی شروع ہونے کے بعد گلابی جاڑا آ گیا تھا۔ اور دشت ارژن نے تو سردی کا وہ زور دکھایا کہ دانت سے دانت بجا دیے۔ ایک تو ہم اب بہت بلندی پر آ گئے تھے اور سردی قدرتی تھی دوسرے دشت ارژن میں ہم کو نہایت ہی اچھا جما جمایا بیٹھا دہی آ گیا تھا۔ آٹھ نو بجے رات کو خود کھانا پکانا مشکل تھا۔ ہم سب نے بڑے شوق سے اسی کو نان خورش بنایا اور خوب ڈٹ کر کھایا۔ تیسرے سونے کے لیے ہم کو کوئی مسقف جگہ اس مکان میں نہ ملی۔ زیر آسمان ہی بستر کرنا پڑا۔ اس نے اور سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ اول شب میں تو حضرات سوتے رہے لیکن پچھلے پہر جب سردی نے مزاج پرسی شروع کی تو کہاں کا سونا اور کس کی نیند۔ باری باری سے ایک ایک کر کے چادر رضائی کمبل اور لحاف سبھی تو نکالے گئے لیکن سردی تھی کہ ان میں سے ایک کو بھی مانتی نہ تھی۔ آج اس کیفیت کے یاد کرنے میں پُر لطف مسرت حاصل ہوتی ہے لیکن اس وقت کا سماں قابل رحم تھا۔ میر ولایت حسین صاحب غریب میر قافلہ ہونے کے سبب سے دہری بلا میں مبتلا تھے۔ پہلے تو انھوں نے سب کو اوڑھنا بڑھایا۔ پھر خود بھی اپنے کمبلوں میں جا گھسے اور گٹھری بن کر پڑ رہے۔ جب حضرت کو پھر بھی سردی معلوم ہوئی تو اپنے ساتھیوں میں سے ایک ایک کا نام لے لے کر پوچھنے لگے کہ سردی تو نہیں معلوم ہوتی۔ سب حضرات خود گول مول

بنے ہوئے پڑے تھے، جواب کیا دیتے۔ اوروں کی تو خبر نہیں لیکن میں یقیناً جاگتا تھا۔ مجھ پر لحم و شحم کا دہرا لحاف اگرچہ اوروں سے زائد تھا مگر وہ بجائے میری سپر ہونے کے مجھ کو اور بڑا آماج گاہ بنائے ہوئے تھا۔ بہر حال میں نے میر صاحب کی آواز سنی لیکن عمداً چپکا رہا تاکہ وہ یہی سمجھیں کہ ہم سب سو رہے ہیں۔ خدا خدا کر کے صبح ہوگئی اور ہم بلا کشان محبت سویرے ہی کوے یار کی طرف روانہ ہو گئے۔

زیارت گاہ

منزل دشت ارژن پر پہنچنے سے پہلے آبادی کے متصل ہم کو ایک بہت بڑے چشمے سے، جس کی صورت پہاڑی ندی کی سی ہوگئی تھی، گزرنا پڑا۔ عمق اس کا کمر تک کسی جگہ نہیں تھا لیکن زور ہر جگہ اس قدر تھا کہ زمین پر پیر مشکل سے ٹھہرتا تھا۔ عرض ۵۰ قدم سے زیادہ رہا ہو گا کہ پہاڑ سے متصل اس ندی کے بیچ میں ہم نے ایک معمولی وضع کی گنبد دار مختصر سی عمارت دیکھی۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ یہ زیارت گاہ ہے۔ اسی مقام پر مشہور ہے کہ حضرت علی ابن ابی طالب صلواۃ اللہ و سلامہ علیہ نے حضرت سلمان کو شیر سے بہ اعجاز بچایا تھا۔ یہ زمانہ روحانیت کے تنزل اور مادیات کی ترقی کا ہے۔ مشائخ و اولیا کے کشف و کرامات تو ایک طرف رہے، ائمہ و انبیا کے معجزہ سے بھی انکار ہے۔ انگریزی داں حضرات بہ تتبع سر سید احمد خاں مرحوم ایک سرے سے معجزے کے امکان ہی سے انکار کرتے ہیں۔ میں نے انگریزی پڑھی تو ہے لیکن اس وقت جب بوڑھا طوطا ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے کچھ تھوڑی بہت پرانی درسی اور مذہبی کتابوں کی مٹی پلید کرتا رہا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ ترقی کے راستے میں ادھر ہی رہ گیا۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم، نہ ادھر کے ہوئے نہ ادھر کے ہوئے۔ اب ہندوستان کے شہر شہر اور گاؤں گاؤں میں جو قدم شریف (قدم رسول ﷺ) اور پنجہ شریف (پنجہ علیؑ) وغیرہ ہیں، ان کے سامنے وہم

سے نہیں گرتا۔ جو واقعات اسلامی تاریخوں میں بطور متواترات کے مذکور ہیں اور عام طاقت بشری کے مافوق ہیں ان کے مشاہد کے سامنے اب بھی سر ادب خم کرتا ہوں۔

خان زنیان

دشت ارژن سے ہم صبح نہایت سویرے روانہ ہوئے تھے۔ روانگی کے وقت ہم کو معلوم ہوا کہ یہاں تار گھر بھی ہے۔ چونکہ مقام بستی سے نکل کر سر راہ تھا۔ اس لیے ہم وہاں بھی چلے گئے۔ تار کے منشی صاحب اتنی سویرے وہاں کیوں ہوتے لیکن ایک چپراسی موجود تھا۔ چونکہ منشی صاحب کے انتظار میں ہم دیر تک ٹھہر نہیں سکتے تھے اور مرزا محمود خان صاحب شیراز بنک کے نام اپنی آمد کا تار دینا چاہتے تھے اس لیے مجبوراً ہم نے مضمون تار ایک سادہ کاغذ پر (کیونکہ تار کا فارم کوئی نہیں تھا) لکھ کر چپراسی کے حوالے کیا اور اجرت اس کے سپرد کی۔ نوے فیصدی تو خیال یہی تھا کہ تار نہیں دیا جائے گا۔ لیکن دس فی صدی یہ بھی امید تھی کہ شاید چپراسی صاحب کو ہماری مسافرت پر رحم آئے اور وہ تار دلوا ہی دیں۔ آخر ہمارا پہلا ہی خیال بعد میں صحیح نکلا اور کوئی تار مرزا صاحب کے پاس نہیں پہنچا۔

دیہاتی مرد و عورت

خان زنیان تک راہ میں کسی اونچے پہاڑ پر چڑھنا اترنا نہیں پڑا۔ یہاں ہم گیارہ بجے دن کے پہنچ گئے اور درختوں کے سایہ بھی پناہ گزیں ہوئے۔ راہ میں کھلے مقامات پر زراعت کے دیکھنے کا پہلے ہی اتفاق ہوا تھا۔ یہاں دیہاتیوں کو زراعت میں زیادہ تر مصروف پایا۔

بوشہر کے قرب و نواح کے دیہاتیوں کی بہ نسبت لطافتِ آب و ہوا کے باعث ان اطراف کے باشندے زیادہ تر سرخ و سفید اور موٹے تازے نظر آئے۔ دیہاتی مردوں کا لباس علی العموم ایک ڈھیلا

پائچوں کا پاجامہ، تیل کے رنگ میں رنگا ہوا، ایک کرتا جو کمر سے ذرا نیچے تک پہنچتا ہے، وہ بھی ہلکے نیل میں رنگا ہو، سر پر ایک اونچی ایرانی ٹوپی سیاہ رنگ کی۔ پیر میں ملکی، جو وہیں کا بنا ہوا ایک قسم کا جوتا ہوتا ہے، وبس۔ یہ جوتا تمام سوت کا بنا ہوا ہوتا ہے اس کا تلا بھی نہایت موٹے کپڑے کی پٹیوں کو سی کر بنتا ہے۔ اس میں چمڑے کا کہیں نام نہیں ہوتا۔ یہ جوتا خوش وضع چاہے نہ ہو لیکن آرام دہ اور دیر پا ضرور ہوتا ہے۔ دیہاتی عورتیں ایک ڈھیلا کرتا پہنتی ہیں جو گردن سے لے کر ٹخنوں کے قریب تک پہنچتا ہے۔ یہ اگر کسی رنگین کپڑے کا نہ ہو تو نیل میں رنگ لیا جاتا ہے۔ سر پر ایک رومال تکونا پڑا ہوا ہوتا ہے۔ باقی اللہ اللہ خیر صلاح۔ پیر میں جوتا یا ٹانگوں میں پاجامہ نہیں ہوتا۔ بعض عورتوں کی کمر بھی پٹکے سے بندھی ہوتی ہے۔ ان کے قدرتی خوبصورت سرخ چہرے، سیاہ بڑی آنکھیں، سڈول بدن کو کسی بیرونی زیبائش کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اجنبی مسافر دور سے دیکھتا ہے اور صانع حقیقی کو سراہتا رہ جاتا ہے۔ پیر البتہ مور کے پیروں کی طرح چہرے سے کچھ مناسبت نہیں رکھتے۔ قدرت نے تو ان کو بھی کوئی اور ہی چیز بنایا ہوگا لیکن بیجا استعمال سے ان کی صورت بگڑ جاتی ہے۔

خان زنیان سے ہم چار بجے سہ پہر کو روانہ ہوئے۔ دور تک ایک ایسی پہاڑی ندی کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ کیسا صاف و شفاف پانی، سنگریزے تو سنگریزے مجھ کو چلتی پھرتی بھاگتی دوڑتی مچھلیاں تک ایک ایک کرکے ایسی صاف نظر آتی تھیں جیسے ڈھلوان بلوریں طشتری میں سیاہ تسبیح کے بکھرے ہوئے دانے۔ ندی کے کنارے کنارے دامنِ کوہ میں زراعت بھی برابر کھڑی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ دن چھپتے تک ہم برابر یوں ہی قدرت خدا کا نظارہ کرتے چلے گئے اور چونکہ منزل مقصود کی یہ آخری منزل ہم طے کر رہے تھے، اس لیے دل اندر سے خوش تھا۔ جانتے تھے کہ صبح ہم ہوں گے اور شیراز۔ ایک تو سرسبز اور شاداب قطعۂ زمین پر سے گزر ہی رہے تھے، دوسرے جان خوش تو جہان خوش۔ شیراز پہنچنے کی خوشی میں معمولی سے معمولی چیز بھی دلفریب نظر آتی تھی۔ آخر کار ان سب مناظر پر

رات نے آکر پردہ ڈال دیا اور ہم شیراز کے شیریں خواب دیکھتے نیم خفتہ و نیم بیدار چلنے لگے۔ انتظار کی رات جیسی لمبی اور سخت ہوتی ہے ظاہر ہے اس پر طرہ یہ ہوا کہ متواتر زحمت سفر اور بے خوابی کے سبب سے مجھ کو آدھی شب کے بعد تپ آگئی اور انتظار کی رات بیمار کی رات بھی بن گئی۔ اب اس کی درازی کا کیا پوچھنا کاٹے نہیں کٹتی تھی۔ شیراز پہنچنے تک راہ میں برابر ہمارے دونوں طرف باغات ملتے گئے۔ لیکن رات کے وقت اور طبیعت کی بدمزگی نے کوئی لطف اٹھانے نہ دیا۔ بارے خدا خدا کر کے ایک گھنٹہ رات رہے ہم شیراز پہنچ گئے اور چونکہ شہر پناہ کا دروازہ بند تھا اس لیے بیرون شہر اپنے اپنے بستر لگا کر پڑ رہے۔

شیراز میں داخلہ

ایک گھنٹے کی نیند اور صبح کی ٹھنڈی ہوا نے میرے بخار کو کافور کر دیا۔ علی الصباح دروازہ کھلنے کے ساتھ ہی ہم لوگ مرزا محمود خاں صاحب ملازم شیراز بنک کو تلاش کرتے ہوئے بنک میں پہنچے۔ بنک سے مرزا صاحب کے مکان پر آئے۔ بنک کا پتہ لگانے اور مرزا صاحب کے مکان تک پہنچے میں شہر کی گلیوں اور بعض بازاروں سے گزر ہوا۔ اگرچہ ابھی بہت سویرا تھا۔ پھر بھی بازاروں میں خاصی آمدورفت تھی۔ اجنبیوں کو لوگ بری طرح گھورتے تھے اور اجنبی بھی جنھوں نے اس سرزمین تک پہنچنے میں سمندر اور پہاڑ دشت و دریا قطع کیے تھے، خوب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ ان غریبوں کے واسطے تو ہر چیز قابلِ دید تھی۔ ان کی نظر ایک چیز پر اچھی طرح رکنے بھی نہ پاتی تھی کہ دوسرا منظر سامنے آجاتا تھا۔

مرزا محمود خاں و مرزا ابوالقاسم

گلیوں کا طواف کرتے کراتے آخر کار دو گھنٹے دن چڑھے ہم لوگ مرزا محمود خاں صاحب کے مکان پر پہنچے۔ معلوم ہوا کہ مرزا صاحب باہر گئے ہوئے ہیں۔ لیکن ان کا لڑکا مرزا ابوالحسن خان خاناں موجود تھا۔ اس کی عمر چودہ سال سے زیادہ نہ ہوگی لیکن خاصا تربیت یافتہ و ذکی تھا۔ اس نے فوراً مہمانوں کو منزل میں اتارا اور لوازم مہمانداری ادا کرنے شروع کر دیے۔ تھوڑی دیر کے بعد خود میرزا تشریف لائے اور ہم لوگوں سے مل کر کمال مسرت و انبساط کا اظہار فرمایا۔ مرزا صاحب متوسط القد، گداز جسم اور نہایت خلق کے آدمی ہیں، انگریزی جانتے ہیں اور شیراز بنک میں ہیڈ مترجم ہیں۔ معزز خاندان کے آدمی ہیں اور باوجود اس کے کہ ایران میں دولت مند ہونا خطرہ سے خالی نہیں، انھوں نے ذاتی بہت کچھ جائداد پیدا کرلی ہے۔ ہمارے مشن کی کامیابی میں بہت بڑا حصہ ان کی مساعی جمیلہ کا ہے جس کا بیان اپنے اپنے موقع پر آگے آئے گا۔ مرزا صاحب سے خط و کتابت ہندوستان سے ہی ہوئی تھی اور انھوں نے اپنے لڑکے کو علی گڑھ بھیجنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ پہلے ہی روز یہ دریافت ہو کر کہ وہ اب بھی اپنے صاحبزادے کو ہمارے ساتھ بھیجنے پر طیار [تیار] ہیں بڑی خوشی ہوئی۔

مرزا صاحب کے مکان پر سے ہم لوگ پھر بنک کو واپس آئے اور ایسے تھکے ماندے تھے کہ دیر تک برابر سوتے رہے۔ اس درمیان میں مرزا صاحب نے ہمارے زمانہ قیام شیراز میں ٹھہرنے کے لیے مرزا ابوالقاسم صاحب ہندی کا مکان تجویز کیا۔ چنانچہ شام کو ہم ان کے مکان پر آرہے۔ مرزا ابوالقاسم صاحب ایک معمر آدمی ہیں۔ ابتدائے عمر میں شیراز آئے اور یہیں رہ گئے۔ یہیں انھوں نے شادیاں کیں اور صاحب اولاد ہوئے۔ ان میں سوا نام کے اور کوئی ہندی اثر نہیں ہے۔ ہندوستانی زبان بھی ایرانیوں ہی کی طرح بولتے ہیں۔ آدمی وجیہ، ملنسار اور خوش خلق ہیں۔ اپنی ذاتی قابلیت اور میل جول سے انھوں نے بڑا رسوخ پیدا کرلیا ہے۔ باوجود پیرانہ سالی کے اب بھی اپنے کاروبار میں چست ہیں

شیراز کے اکثر حضرات ان کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ وہاں کے لوگوں کا خیال ہے کہ خفیہ طور سے ان کو سرکار انگریزی سے تنخواہ ملتی ہے اور یہ انگریزی قنصل کو خبر رسانی کا کام کرتے ہیں۔

مسٹر کمبل، قنصل انگریزی

دوسرے ہی روز ہم مسٹر کمبل[10] انگریزی قنصل سے ملے اور لارڈ کرزن بہادر کے پرائیویٹ سکریٹری مسٹر لارنس[11] کا خط پیش کیا۔ جس مہربانی خلوص محبت بلکہ تعظیم سے قنصل صاحب پیش آئے وہ بھلایا نہیں جاسکتا۔ ان کے برتاؤ میں اور ہندوستان کے انگریزوں کے برتاؤ میں زمین آسمان کا فرق تھا ۔ میں اس بات کو مانتا ہوں کہ حاکم و محکوم میں مساوات نہ ہوسکتی اور نہ ہونی چاہیے۔ اس کا بھی قائل ہوں کہ غیر ملک میں جہاں اوروں کو بھی اپنا سلوک اپنی رعایا کے ساتھ دکھلانا منظور ہو۔ رعایا کے ساتھ برتاؤ زیادہ فراخدلی کے ساتھ کرنا مناسب ہے۔ لیکن پھر بھی خاص ہندوستان میں ہندوستانیوں کے ساتھ اس معاملے میں جو تنگ دلی انگریزوں کی طرف سے برتی جاتی ہے، وہ بہت کچھ قابلِ اصلاح ہے۔

دورانِ قیام شیراز میں ہم کو تین چار مرتبہ قنصل صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ ہمیشہ مہربانی کے ساتھ پیش آتے رہے۔ ہماری اغراض سے کماحقہ اظہار ہمدردی فرمایا لیکن کامیابی کی نسبت بہت زیادہ اشتباہ ظاہر فرمایا۔ لڑکوں کے ساتھ لے جانے کے بابت کہا کہ جب تک تم ان کو لے کر بوشہر سے روانہ نہ ہولینا ان کے لے جانے کا اعتبار نہ کرنا اور اگر تم کو تین چار لڑکے بھی ساتھ جانے والے مل جائیں تو سمجھنا کے تم کو بہت بڑی کامیابی ہوئی۔

شاہ ایران کا روز ولادت

ہمارے شیراز پہنچنے کے دوسرے ہی روز یعنی ۶ / ستمبر مطابق ۱۳ / جمادی الثانی کو مظفر الدین شاہ[۱۲]، شاہ کج کلاہ ایران کی پیدائش کا دن تھا۔ تمام گلی کوچوں میں سامان آرائش پہلے ہی سے ہو رہا تھا۔ رات کو ہر جگہ خوب چراغاں کیا گیا۔ خاص کر محلات شاہی تو بالکل بقعۂ نور معلوم ہوتے تھے۔ شاہی محل کے سامنے ایک بہت بڑے فراخ احاطہ میں فوج جمع ہوئی۔ کناروں پر گرداگرد اور ایرانی حضرات ٹھٹ کے ٹھٹ جمع تھے۔ برابر تخت کرسی وغیرہ کا فرش تھا۔ چاے کے دور چل رہے تھے۔ تکلفات سے مشغلہ تھا۔ قلیان وسگار دھواں دار اڑ رہے تھے۔ بینڈ باجا برابر بج رہا تھا۔ ہر طرف شہنائی بج رہی تھی۔ گورنر صاحب خود بہ نفس نفیس اہتمام میں مصروف تھے۔ قنصل روس و انگریزی گورنر کے مہمان تھے۔ چنانچہ جس طرح سے یہ قنصل صاحبان گورنر صاحب کے ہمراہ نکل جاتے تھے "زندہ باد شاہ ما، پائندہ باد ایران ما" کے نعرے اس طرح سے بلند ہوتے تھے کہ دل دہل جاتے تھے۔ کسی قدر آتش بازی بھی چھوڑی گئی لیکن وہ ایسی گھٹیا درجہ کی تھی کہ اس سے بہتر ہمارے یہاں معمولی شب برات میں لڑکے چھوڑ لیتے ہیں۔

شیراز میں ہماری کامیابی کے ذرائع کا بگڑنا اور بننا

ہندوستان سے روانگی کے وقت ہم کو اپنی کامیابی کے متعلق بڑی امید مولوی سید حسن عسکری صاحب سے وابستہ تھی۔ تھوڑا عرصہ قبل یہ علی گڑھ کالجیٹ اسکول میں ملازم تھے اور وہاں سے ترکِ ملازمت کر کے شیراز پہنچ گئے تھے مولوی صاحب موصوف کا ایک تاکیدی خط بھی ہمارے کالج کے پرنسپل مسٹر ماریسن صاحب کے نام آیا تھا جس میں انھوں نے علی گڑھ سے ایک ڈپوٹیشن طلب کیا تھا اور کامیابی کی بڑی امید ظاہر کی تھی۔ مولوی صاحب سے چونکہ ہم سب ذاتی طور پر واقف تھے اور ان کے علاوہ سارے ایران میں کسی دوسرے شخص سے ذرا بھی واقفیت نہ تھی اس لیے قدرتی طور سے

سارے راستے میں ہم کو ان کے ذریعے سے اکابر شیراز سے ملنے اور اپنے مقاصد کے متعلق گفتگو کرنے کے گویا خواب آتے رہے۔ جس روز ہم بوشہر پہنچے اس کے دوسرے ہی روز کیا دیکھتے ہیں کہ مولوی صاحب خود بہ نفس نفیس ملنے کو چلے آرہے ہیں۔ اک ذرا ہم کو پہچاننے میں توقف ہوا کیونکہ ہندوستان میں مولوی صاحب علما کے لباس میں رہا کرتے، پیش نمازی فرماتے اور قال اللہ و قال الرسول کیا کرتے۔ یہاں ایرانی کوٹ پتلون اور بوٹ ڈٹا ہوا، سر پر اونچی ایرانی ٹوپی، ہاتھ میں چھڑی اور منہ میں چرٹ۔ پہچاننے میں توقف تو ہونا ہی تھا مگر یہ وقفہ صرف چشم زدن کا تھا۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم

السلام علیکم کی آواز نے، جس سے ہمارے کام پہلے ہی سے آشنا تھے، اور بھی رہا سہا بھرم کھو دیا۔ پھر تو ہم سب بڑی خوشی سے اٹھے۔ مصافحہ اور معانقہ کی ٹھہری اور گھل مل کر باتیں شروع ہوئیں۔ اب ہم خوش ہیں اور دل میں کہہ رہے ہیں کہ مولوی صاحب نے بڑی تکلیف اٹھائی کہ ہمارے استقبال کو شیراز سے بوشہر تک چلے آئے۔ لیکن مزاج پرسی اور ذاتیات کے بعد جب حرف مطلب زبان پر آیا تو معلوم ہوا کہ مولوی صاحب کو بغداد کے انگریزی قنصل خانہ میں کوئی جگہ مل گئی ہے اور وہ اب بغداد تشریف لیے جارہے ہیں۔ لا الٰہ الا اللہ۔ ہمارے چہرے فق سے ہو گئے اور تھوڑی دیر کے لیے تو ہمارے سارے منصوبے خاک میں مل گئے۔

اب بوشہر سے شیراز تک راستے میں اپنی کامیابی کا جب خیال آتا تو سوائے خدا کے اور کسی پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ واقعی اسی پر بھروسہ قابل اعتماد اور اسی پر اعتماد قابل بھروسہ کے ہے۔ شیراز پہنچ کر مرزا محمود خاں صاحب بغیر کسی سابقہ شناسائی کے ہمارے کام میں ایسے مستعد ہو گئے کہ ہم کو مولوی حسن عسکری صاحب اپنی ضرورت کے لیے بھولے سے بھی یاد نہیں آئے۔

اگر او ز حکمت بہ بند و درے [۱۳]
بہ رحمت کشاید درے دیگرے

علاءالدولہ گورنر فارس کی خدمت میں ہمارا ایڈریس پیش کرنا

ہندوستان سے ہم نے اپنے ساتھ اشتہارات چھپوا کر لے لیے تھے جن میں مدرسۃ العلوم کے مختصر حالات، اپنے آنے کا مقصد اور وہاں کے خرچ کا اندازہ تحریر تھا۔ اگرچہ ہم نے عمائد شہر سے ملنا شروع کر دیا تھا لیکن عام طور پر اپنے اشتہارات تقسیم نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ ابھی تک گورنر فارس سے ہم نے کسی قسم کی اجازت نہیں لی تھی۔ گورنر صاحب کی خدمت میں باریابی کوئی آسان بات نہ تھی۔ اس معاملہ میں ہم کو اپنے قنصل صاحب سے مدد لینی پڑی۔ انھوں نے یہ کام موقر الدولہ صاحب کے سپرد کیا۔ موقر الدولہ کبھی بمبئی میں سفیر ایران تھے۔ اور اب گورنر فارس کے مصاحب خاص تھے۔ انھوں نے ہم کو باریابی کی اجازت دلوائی۔ چنانچہ شیراز میں پہنچنے کے پورے دس دن کے بعد ہم کو شرف ملازمت حاصل ہوا۔ میر ولایت حسین صاحب نے پہلے سے ایک ایڈریس فارسی میں تیار کر لیا تھا۔ سید ابو محمد صاحب نے ایک قصیدہ موزوں کر رکھا تھا۔ گورنر صاحب اپنے محل کے ایک دریچہ میں رونق افروز تھے۔ دو تین مصاحبین سر جھکائے مؤدب دوزانو پاس بیٹھے ہوئے۔ موقر الدولہ پائیں باغ میں جس طرف کہ یہ دریچہ کھلتا تھا ہم لوگوں کو لے گئے۔ زمین سے قد آدم یہ دریچہ بلند تھا۔ موقر الدولہ نے ہم سب کو پیش کیا۔ ہم سب نے تا بہ زانو خم ہو کر سلام کیا۔ پھر اجازت لے کر میر صاحب نے ایڈریس سنایا۔ جس کے جواب میں گورنر صاحب نے اپنی خوشنودی ظاہر فرمائی۔ ہمارے مقاصد سے اپنی ہمدردی کا اظہار کیا۔ اور ہم کو ہر طرح کی مدد دینے کا وعدہ فرمایا۔ ابو محمد صاحب کو قصیدہ سنانے کا موقع نہیں ملا۔ وہ بجنسہٖ خدمت اقدس میں پیش کر دیا گیا۔ ہم کو یہ بات گراں گزری کہ ہماری پیشی

اس طرح ہوئی کہ ہم کو مکان میں داخل ہونے کا موقع بھی نہیں دیا گیا۔ بیٹھنے کا تو بھلا کیا ذکر تھا۔ لیکن مجبوری تھی۔ ہمیں اپنے کام سے کام تھا۔ باریابی کے بعد گورنر صاحب کے حکم سے ہم عمارت کے ایک اور حصہ میں جو خوب قالینوں اور تکیوں سے آراستہ تھا داخل کیے گئے۔ اور ہماری چاے، شربت و نقل سے تواضع کی گئی۔ ایں ہم غنیمت است۔

شاہزادہ موید السلطنۃ افسر تلغراف

گورنر صاحب کی خدمت میں باریابی اور ان کی خوشنودی مزاج حاصل کرنے کے بعد ہم نے اپنے کام میں زیادہ مستعدی ظاہر کی۔ شاہزادہ موید السلطنۃ صاحب سے ایک مرتبہ پہلے بھی مل چکے تھے۔ اب ان کی خدمت میں زیادہ حاضر ہونے لگے۔ یہ بزرگ خاندان قاچار سے ہیں اور تین واسطہ سے ان کا نسب شاہ کج کلاہ ایران سے جاملتا ہے۔ محکمۂ تار صوبہ فارس کے افسر ہیں اور اس قدر خلیق ملنسار اور لوگوں کے ساتھ بھلائی کرنے والے ہیں کہ سارے شہر میں لوگ ان کا ذکر خیر کے ساتھ کرتے ہیں۔ ان کا بڑا لڑکا جس کی عمر تخمیناً ۱۹ / سال کی ہوگی ان کا نائب تھا۔ کسی قدر انگریزی پہلے سے جانتا تھا۔ اور عربی میں بڑی درسی کتابیں پڑھتا تھا۔ شاہزادہ صاحب کے متعلق معلوم ہوا تھا کہ وہ اپنے اس لڑکے کو چاہتے ہیں کہ عربی اور انگریزی میں کامل دستگاہ پیدا کرے۔ ہم نے اس خیال سے کہ اگر ہم کو یہاں کامیابی ہوگئی تو دوسری جگہ زیادہ آسانی ہوگی، اپنی ساری کوشش شاہزادہ صاحب کے یہاں صرف کرنی شروع کی۔ سید ابو محمد صاحب نے مدرسۃ العلوم کی تعریفوں کے وہ پل باندھے کہ بغداد و قرطبہ کے منظر کے ساتھ یورپین یونیورسٹیز کا خاکہ کھینچ دیا۔ میر ولایت حسین صاحب کو یا مجھ کو اکثر سید ابو محمد صاحب کی تقریر کے اختتام پر کہنا پڑتا تھا کہ مسلمانانِ ہند کی کوشش ہے کہ مدرسۃ العلوم ایسا ہی ہو جائے جیسا کہ سید صاحب نے بیان کیا ہے اگرچہ ابھی اس درجہ کو نہیں پہنچا ہے۔ مرزا محمود خان

صاحب جو ہمارے مدرسۃ العلوم پر ایمان بالغیب اول روز دعوت لا چکے تھے، برابر ہماری تائید میں رطب اللسان رہے۔ شاہزادہ صاحب کی آرزوؤں کا خلاصہ اس فقرہ سے ظاہر ہو گا۔ ”بندہ میخواہم کہ فرزند من در انگلیسی یک مرزائے عامل دور عربی فقیہ کامل بشود“ (فارسی کا فقرہ غالباً سوائے الفاظ مرزا وفقیہ کے میرا اپنا ہے)۔ ایران میں میرزا منشی کو کہتے ہیں لہٰذا انگریزی میں منشی بنادینا تو مدرسۃ العلوم کے لیے بڑی بات نہ تھی۔ البتہ فقیہ کامل کی شرط ٹیڑھی کھیر تھی۔ ہم کو کہنا پڑا کہ دینیات کی تعلیم کا سلسلہ ہمارے یہاں ابھی ایسا نہیں ہے کہ جس سے کوئی طالب علم فقیہ کامل بن سکے۔ البتہ معلم ایسے عالم موجود ہیں کہ اگر متعلم کو خود شوق ہو تو وہ اس کو بہت کچھ مدد دے سکتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ چار پانچ روز کی متواتر کوشش کے بعد شاہزادہ صاحب اپنے فرزند کے بھیجنے پر راضی ہوئے۔

شاہزادہ صاحب کا رام کر لینا ہمارے لیے بڑی کامیابی تھی۔ ہم نے قنصل صاحب کو اطلاع دی تو انھوں نے بھی مبارک باد دی۔ اور اب ہم کو اور عمائد شہر سے ملنے اور کہنے سننے کی زیادہ جرات ہوئی۔

علما اور ہم

گورنر صاحب کی خوشنودی اور شاہزادہ صاحب کی اپنے فرزند کو ہمارے ساتھ بھیجنے کی رضا مندی حاصل کر لینے کے بعد بظاہر ہمارا راستہ کھلا ہوا تھا۔ لیکن ہم کو خیال پیدا ہوا کہ اگر ہمارے مقاصد سے نارضا مندی کا اظہار علما کی طرف سے ہو گیا تو ایک منٹ میں سارا کھیل بگڑ جائے گا۔ اس لیے ابتدائی کوشش میں ہم جناب مرزا آغا محمد ابراہیم صاحب کی خدمت میں، جو شیراز میں سرگردہ مجتہدین میں سے ہیں، حاضر ہوئے۔ اتفاق سے وہ دن مجتہد صاحب کے ہاں مجلسِ ماتم شہدائے کربلا کا تھا جو ہفتہ وار ہوا کرتی ہے۔ مجلس میں ہم لوگ شریک ہوئے اور بعد مجلس مجتہد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کے گردیوں بھی کافی مجمع تھا۔ پھر ہم اجنبیوں کو مجتہد صاحب کے قریب دیکھ کر اور

لوگ بھی جمع ہو گئے۔ معمولی احوال پرسی کے بعد ہم نے اپنا راگ چھیڑا۔ اور اعلانات پیش کیے۔ کس قدر خوشی ہوئی جب مجتہد صاحب سے بھی اپنے مقاصد کے متعلق تائید کے الفاظ سنے۔ بات یہ تھی کہ چونکہ شیراز میں انگریزی تعلیم کی خواہش بڑھتی جاتی ہے اور امرا بالعموم اپنے لڑکوں کو یورپ بھیجتے ہیں۔ لہٰذا مجتہد صاحب کو یہ غنیمت معلوم ہوا کہ لڑکے تعلیم انگریزی کے لیے ہندوستان میں مسلمانوں کے خاص مدرسہ میں آئیں جہاں دینیات کی تعلیم کا بھی خیال کیا جاتا ہے۔ ہمارے اعلانات پر تعلیم مذہبی کا خاص طور سے ذکر ہر جگہ جادو کا اثر کرتا تھا۔ اگرچہ اپنے مقام پر ہم کو یہ افسوس ہوتا تھا کہ اس کے حقیقی معنی کیا ہیں اور کیا سمجھے جاتے ہیں۔ بارہا ہم کو اصلیت زبانی بیان کرنی پڑتی تھی۔ لیکن گھٹ گھٹا کر بھی جو اس کا اثر باقی رہ جاتا تھا وہ منتر کے اثر کو زائل ہونے نہیں دیتا تھا۔ اعلیٰ طبقہ میں وہاں کے بے دینی دیکھ کر جو کچھ مختصر سی کوشش ہمارے مدرسۃ العلوم کی طرف سے دین کی جانب کی جاتی تھی وہ غنیمت معلوم ہوتی تھی۔

اسپ نہیں جمل نہیں خواجہ برہ رساں تو ہے
کچھ نہیں خیر کچھ نہیں ایک نہیں سے ہاں تو ہے

ہماری کوشش کا خلاصہ

گورنر اور علما دونوں کی طرف سے اطمینان حاصل کر کے ہم نے جان توڑ کوشش شروع کر دی۔ اگر سب کا مفصل ذکر کیا جائے تو نہایت طویل ہو گا۔ خلاصہ یہ ہے کہ صبح ہونے کے بعد ضروریات سے فارغ ہو کر ہمارا گشت شروع ہو جاتا۔

علی الصباح چو مردم بہ کاروبار روند
بلا کشاں محبت بہ کوئے یار روند

جہاں سنتے کہ اس گھر کا مالک خوشحال ہے اور اس کے پاس اولاد مذکور قابل تعلیم موجود ہے وہاں جا پہنچتے۔ اپنی کہتے، اس کی سنتے، کہیں صاف جواب ملتا کہیں گول مول، کہیں امید بندھتی کہیں ناامیدی ہوتی۔ ہماری کوشش یہی رہتی کہ انکار محض کہیں سے نہ ہو۔

جھڑکی سہی اداسی چیں بر جبیں سہی
یہ سب سہی پر ایک نہیں کی نہیں سہی

غرض یہ کہ ہماری روانگی تک شیراز کے پانچ لڑکے ہمارے ساتھ آنے والے مل گئے اور مرزا محمود خان صاحب کی خاص کوشش سے ایک لڑکا اصفہان سے آگیا۔ اس طرح چھ ایرانی لڑکوں کو لے کر ہم شیراز سے روانہ ہوئے۔ افسوس ہے کہ شیراز میں ہمارے قیام کا زمانہ گنتی کے پچیس دنوں پر مشتمل تھا۔ اس میں سے ابتدا کے دس دن گورنر اور علما کی خوشنودی و مزاج حاصل کرنے میں لگ گئے۔ عین اس وقت جبکہ ہماری کوششیں بارور ہو چلیں ہم کو ہندوستان واپس آنا پڑا۔ کیونکہ زمانہ تعطیل ختم ہو رہا تھا۔ اگر ہم تھوڑے دنوں وہاں اور رہ سکتے تو غالباً بلکہ یقیناً ہمارے ساتھ آنے والے طلبا کی تعداد اور بھی بہت زیادہ ہوتی۔ لیکن پھر بھی جو ہمارا مقصود تھا، اس میں ایک حد تک کامیابی ہوئی۔ کچھ لڑکوں کو بھی ہم اپنے ساتھ لا سکے اور خود بلا مبالغہ مجسم اشتہار بن کر ہم نے اپنے کالج کو خوب اچھی طرح مشتہر کیا۔ جس کا بعد میں یہ نتیجہ نکلا کہ از خود بھی ایران سے ہمارے کالج میں طلبا آئے۔

اب قبل اس کے کہ ہم شیراز سے رخصت ہوں ایک سرسری نظر ان امور پر ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے جو ہماری نظر سے یہاں گزرے۔ ابتداءً ہی یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ہمارے جو کچھ بھی

خیالات ظاہر ہوں گے وہ محض سرسری نظر کا نتیجہ ہیں۔ اور ہم کو خود کوئی دعوی نہیں ہے کہ یہ بیانات قابل تردید ہیں۔

حکومت

جہاں تک ہم کو معلوم ہوا صوبہ کی ایالت یا گورنری مثل ٹھیکہ داری کے کام کے اس شخص کے سپرد کی جاتی ہے جو سب سے زیادہ محاصل سال دینے کا وعدہ کرے۔ لہٰذا گورنر کا اصلی تعلق رعایا سے یہ ہوتا ہے کہ وہ ان سے اس قدر وصول کرلے جو طہران کے خزانے کو دینے کے بعد خود گورنر کے ذاتی خزانہ کو بھر سکے۔ چونکہ گورنروں کی برطرفی اکثر رعایا کی بغاوت کے بعد ہوتی ہے۔ اس لیے خود اپنے خیال سے اس کو رعایا پر ضرورت سے زیادہ بار ڈالنے میں پس وپیش ہوتا ہے۔ اور وہ ان کے مابین فلاح وبہبودی کا بھی کوشاں ہوتا ہے۔

راہوں میں امن

اس زمانہ میں جب کہ ہم وہاں تھے راہیں مامون تھیں۔ قافلے برابر شیراز و بوشہر کے درمیان شب و روز آتے جاتے رہتے تھے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر تفنگچی مامور تھے جن کا کام مسافروں کی نگرانی تھا۔ اگرچہ قلت تنخواہ اور اس کے بھی نہ وصول ہونے کے باعث سے وہ اپنا حق الخدمت بہ خوشی یا بہ جبر مسافروں سے وصول کرلیتے تھے۔ لیکن پھر بھی یہ امن کا زمانہ تھا۔ شیراز سے واپسی اور زمانہ قیام بوشہر میں ہم نے ایک روز یہ خبر سنی کہ ایک انگریز مع میم صاحبہ اور اپنے دو ایک ذاتی ملازموں کے شیراز جارہا تھا۔ راہ میں ایک شب کو اس کی میم غائب ہوگئی۔ اور پھر تین دن بعد اسی مقام

پر ملی۔ عام خیال یہ تھا کہ اس کو لٹیرے بہ جبر چرا لے گئے تھے۔ اس خبر کی اصلیت کی نسبت میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ بوشہر میں بہت مشہور ہوئی تھی۔

حواشی:

[1] ۔ گذشتہ دور میں "عراق عجم" ایران کو کہتے تھے اور "عراق عرب" عراق کو۔

[2] ۔ یہ شعر کامل خراسانی (وفات: ۱۲۳۲ ہجری) کا ہے۔

[3] ۔ یہ مصرع اس طرح درست ہے: دم رفتن است عرفی بہ رخش نظارہ ای کن۔ حالانکہ یہ شعر، عرفی کی غزلوں میں شامل نہیں۔

[4] ۔ یہ شعر اس طرح درست ہے:

مبارک باد، عید، آن دردمندِ بے کس را

کہ نہ کس را مبارکباد گوید نہ کس اورا۔ یہ شعر شیخ بہائی (۹۵۳-۱۰۳۰ ہجری) کا ہے۔

[5] ۔ "بکُشید ایں قُرم ساق را۔ بکُشید ایں کافراں را"۔ ان کو مارو۔ ان کافروں کو مار ڈالو۔ "قرم ساق" ایک گالی ہے۔

[6] ۔ روزنامہ مظفری۔ سنہ ۱۳۱۹ ہجری میں میرزا عبدالحمید خان متین السلطنہ نے شہر بوشہر میں اس کا اجرا کیا۔ کچھ دیر بعد، متین السلطنہ طہران گئے اور میرزا علی آقا لبیب الملک شیرازی اس کا مدیر ہوا۔ "روزنامہ مظفری"، ایران، ہندوستان، یورپ، روس، ترکستان میں بھیجا جاتا تھا۔ لبیب الملک شیرازی، مطبع سُربی کے لیے ہندوستان کا رخ کیا۔ ۱۳۲۶ ہجری تہران میں پارلیمنٹ پر بمباری ہوئی چناں چہ لبیب الملک شیرازی، خطرے میں تھا۔ وہ کچھ عرصے کے لیے بوشہر سے ہندوستان گئے۔ میرزا علی آقا لبیب الملک شیرازی کا سنہ ۱۳۳۷ ہجری کربلا میں انتقال ہوا۔ (ص ۲۱۶۔ ۲۱۷، صدر ہاشمی، محمد، تاریخ جرائد و مجلاتِ ایران، جلد چہارم، اصفہان: کمال، دوسری اشاعت، ۱۳۶۳ شمسی)۔

[7] ۔ عیبِ مے جملہ بگفتی، ہنرش نیز بگو: تم نے شراب کی ساریاں خامیاں بتادیں، اس کی خوبیاں بھی اشارہ کر لو۔

[8] ۔ ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بار گاہ ساخت۔ ترجمہ: جہاں گیا، خیمہ بنا دیا اور عمارت بنوائی۔

[9] ۔ یہ مصرع اس طرح درست ہے: رشتہ ای در گردنم...

[10] ۔ Arnold Burrowes Kemball (1820-1908)

[11] ۔ Walter Roper Lawrence (1857-1940)

[12] ۔ مظفر الدین شاہ قاچار (۱۸۵۳ء۔۱۹۰۷ء)۔

[13] ۔ شعر اس طرح درست ہے: اگر اوز حکمت، ببند دری / ز رحمت کشاید درِ دیگرے۔